چاند سے نہ کھیلو
بشریٰ رحمٰن
Ubaid
2002

ایک ہی راز دیکھا......

قلم

ایک ہی غمگسار پایا......

کتاب

بشریٰ رحمٰن صاحبہ ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کے افسانے، ناولٹ اور سفرناموں کے قارئین کا حلقہ وسیع ہے۔ ان کی تحریریں ہماری طرزِ معاشرت کی عکاسی کرتی ہیں اور ان کے موضوعات میں خاصا تنوع ہے۔

انسانی رشتوں کی نزاکت اور رابطوں کا ادراک ان کے ہاں بہت گہرا ہے۔ وہ اپنے افسانے اور ناول کا تانا بانا اس طرح بنتی ہیں کہ قاری کی دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔

شفیق الرحمٰن

ہر رنگ رنگی

شخصیتیں طرح طرح کی ہوتی ہیں- کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر ترس آتا ہے-
ہمدردی پیدا ہوتی ہے- کچھ شخصیتوں کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے پیار آتا ہے-
کچھ شخصیتیں ایسی طاقت ور اور رعب دار ہوتی ہیں کہ دیکھ کر خون آنے لگتا ہے- بشریٰ رحمٰن
کو جب میں پہلی بار ملا تو اسے دیکھ کر ترس آیا ہمدردی پیدا ہوئی - دوسری بار ملا تو خوشگوار حیرت ہوئی
پیار کرنے کو جی چاہا اور اب...... اب مجھے بشریٰ رحمٰن سے خوف آنے لگا ہے- پہلی بار میں بشریٰ
سے تب ملا جب اس نے رحمٰن سے نئی نئی شادی کی تھی- بے چاری یہ کہاں پھنس گئی' کسی آدم زاد
سے بیاہ کرتی - اس جن کے پلے کیوں بندھ گئی- رحمٰن تو جن ہے اور جن بھی ایسا جسے آج تک کوئی
بوتل نہیں بند نہیں کر سکا- جو کسی چراغ کی رگڑ کا پابند نہیں ہے جو " حاضر ہوں آقا' میرے لیے کیا حکم
ہے" کی حوالگی سے قطعی طور پر نا آشنا ہے' بے نیاز ہے- رحمٰن اور میں پرانے ساتھی ہیں- رحمٰن کو میں
اس زمانے سے جانتا ہوں جب اس نے عنفوان شباب میں قدم رکھا تھا- خوش شکلی تھی' خوش مزاجی
تھی- باتوں کی پھلجھڑیاں ورثے میں پائی تھیں- ایک بے نام پراسرار مگر خطرناک جاذبیت تھی-
آنکھوں پر گھنی بھویں اور پیشانی کے درمیان ایک گھوری تھی جو گھورتی بھی تھی- گھورتی کم کم
پچکاتی زیادہ- میں زندگی بھر جنس کا طلب علم رہا ہوں- جنسی ماہرین نے مجھے وارننگ دے رکھی تھی
کہ جس کی آنکھوں پر گھنی بھویں ہوں اور پیشانی پر گھوری ہو اس سے بچ کر رہنا- لیکن رحمٰن سے بچ
کر رہنا ممکن نہ تھا- رحمٰن کی شخصیت کا جزو اعظم یہی ہے کہ اس سے بچ کر رہنا ممکن نہیں-

پھر رحمٰن نے دیکھتے دیکھتے سر پر دو سینگ نکال لیے- ایک ذہانت کا دورا کر دکھانے کا- اور مجھے پتہ چل گیا کہ وہ جن ہے-

بشریٰ رحمٰن جاگیر دارنی تھی- رحمٰن نو دولتیہ تھا- یہ رکھ رکھاؤ کی گود میں پلی تھی- وہ "ٹپر واسیا" تھا- یہ کومل تھی وہ تیور تھا- یہ بھیرویں تھی وہ دیپک تھا- شبنم اور شعلے کا میل دیکھ کر میں گھبرا گیا- میں نے رحمٰن سے پوچھا یہ سبز پری کہاں سے اٹھا لایا ہے تو وہ بولا ہمارے نصیب میں سبز پریاں ہی لکھی ہیں- میں نے کہا اب ہو گا کیا- بولا اب ہم اس کی رکشا کریں گے- میاں بیوی کے تعلق کے اسرار سمجھنا میرے جیسے کتابی آدمی کے بس کی بات نہیں- تخلیہ کے بھید کس نے جانے ہیں- وہاں منہ زبانی دعوے نہیں چلتے- پتہ نہیں کون کس کی رکشا کر رہا ہے رحمٰن کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ بشریٰ کی رکشا کر رہا ہے- بشریٰ کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے وہ رحمٰن کی رکشا کر رہی ہے- شاید دونوں ہی ایک دوسرے کی رکشا کر رہے ہیں-

دوسری بار دیکھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ بشریٰ ادبی دنیا میں چوکڑی مارے بیٹھی ہے- اس کی تحریر کی رنگینی اور روانی نے دھوم مچا رکھی ہے- اس کی تصنیفات تعداد میں یوں بڑھتی جا رہی ہیں جیسے برسات میں کھمبیاں اگتی ہیں- یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ یہ تخلیق کار بہت پیاری لگی- ادب تخلیق کرنا خاصا مشکل کام ہے- لیکن صاحب کتاب بننا بے حد کٹھن مرحلہ ہے- چونکہ پبلشر نہیں ملتا مل بھی جائے تو ایک کتاب شائع کرنے کے بارہ پندرہ ہزار مانگتا ہے- میں نے رحمٰن سے پوچھا میں نے کہا یارا سے پبلشر کیسے مل گیا- بولا اس کا پبلشر میں ہوں ایسی خوبصورت کتابیں چھاپی ہیں کہ پبلشر کیا چھاپے گا- پھر پتہ چلا کہ بشریٰ کی تحریریں صرف پسند ہی نہیں کی جاتیں بلکہ بکتی بھی ہیں- اس کی شہرت سمندر پار پہنچ چکی ہے- اتنی مانگ ہے کہ وطن دوست بنانا پڑا-

اس پر جی جل کر رہ گیا ہم اتنی دیر سے جھک مار رہے ہیں- تحریر کو پسندیدگی بھی حاصل ہو گئی لیکن اول تو کتاب چھپتی نہیں اگر چھپ جائے تو بکتی نہیں پھر یہ سوچ کر دل پر پتھر رکھ لیا کہ کہاں آدم زاد کہاں پری زاد-

پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ محترمہ اخباری کالموں پر چڑھ گئی- ادبی محفلوں میں فی البدیہہ تقریریں

کرنے لگی۔ میں نے رحمٰن سے پوچھا میاں یہ کیا ہو رہا ہے۔

بولا ہمارے ایما سے ہو رہا ہے دوستو مرد ایک جنتی قوم ہے اس کی خوش فہمیاں اسے لے ڈوبیں۔

میں نے میاں سے کہا دیکھ میں تجھے ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں کہ لکھ لیکن تو نے دھیان نہیں دیا۔ بولا کیسے لکھوں بولنے سے فرصت ملے تو لکھیں۔ میں نے کہا احمق ڈکٹافون گلے میں لٹکا لے جو بولتا ہے وہی لکھ دے۔ کہنے لگا بول بلارے میں جو دھما کہ ہے وہ لکھنے میں کہاں۔ میں نے کہا اسے دیکھ وہ جو لکھ رہی ہے۔ کہنے لگا' اسے بولنے کے میدان سے نکالنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔

اب دیکھتا ہوں کہ بشریٰ سیاست میں جا گھسی ہے۔ یہ کیسے ہوا' یہ تو ممکن نہ تھا۔ ادب اور سیاست تو آگ پانی ہیں۔ ادب میں دل کی بات کہہ دو تو بات بنتی ہے۔ سیاست میں خبردار دل کی بات ہونٹوں پر نہ آئے۔

سیاست تو اک گورکھ دھندہ ہے چپ رہو تو مشتبہ لہٰذا لازم ہے کہ بولتے رہو۔ لیکن دل کی بات زبان پر نہ آئے۔

پھر خیال آیا کہ بشریٰ بڑی سیانی ہے کسی کی چمچی بن کر اپنا راستہ نکال لے گی۔ ارے وہ تو فلور پر کھڑی ہو کر پٹاخ پٹاخ باتیں کرنے لگی۔ دوسروں کو ڈانٹنے لگی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلیلیں جھاڑنے لگی۔

میں نے رحمٰن سے کہا اب بولو۔ بولا ابھی تو ہم نے ہاؤس میں ہراول دستہ بھیجا ہے۔ بشریٰ سے میں نے کہا بی بی یہ کس رنگ میں رنگی گئی ہو۔ بولی شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔ اس ہر رنگ میں جلنے والی شمع سے اب مجھے ڈر آنے لگا ہے۔

ممتاز مفتی

محترمہ بشریٰ کی کہانیوں کے مطالعہ کے بعد بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ کہانی کہنے کا بڑا اچھا، بڑا موثر اور خوبصورت ڈھنگ جانتی ہیں اور یہ کسی بھی تخلیق کار کی بڑی نمایاں اور اہم خوبی تصور کی جاتی ہے

مرزا ادیب

انتساب

ہر اس دل

کے نام

جو محبت کی عظمتوں کا

علمبردار ہے

ہک رات دی بات وسار گئیوں؟
میکوں تیر برہوں دا مار گئیوں؟
کیوں جیت کے بازی ہار گئیوں؟
کیا دوش ہے باندی بردی دا؟

"چاند سے نہ کھیلو"

محبت کے لیے دل ڈھونڈ ایسا ٹوٹنے والا
یہ وہ شے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

جی بہت اداس ہے۔

جی کا کیا ہے؟ یہ تو وہ ننھا بچہ ہے جو سدا کسی کھلونے کے لئے مچلتا ہی رہتا ہے۔

دل کے آس پاس درد بھی رہتا ہے۔

یہ درد تو چاند کا ہالہ ہے۔

ہالے کے بغیر تم نے کوئی چاند دیکھا ہے---!

میرا دل بھی تو چاند ہے۔

ایک بار تم نے یہ چاند کھیلنے کو مانگا تھا۔

میں نے تو دے دیا تھا---!!!

زہرا نے باہر نکل کے اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے میں چابی گھمائی تو اس نے دیکھا وہ نووارد بھی اپنے دروازے کو بند کر کے اس میں چابی گھما رہا تھا۔ زہرا نے روزانہ کی طرح ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر لفٹ کی طرف دوڑی۔ لفٹ ابھی ابھی آ کر رکی تھی۔ بٹن نہیں دبانا پڑا۔ وہ دوڑ کر اندر گھسی۔ وہ بھی اس کے پیچھے گھس آیا---لفٹ نیچے کو رینگنے لگی۔ زہرا نے ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا لی اور بھرپور انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

پچھلے ایک ہفتے سے زہرا اسے گرین وڈ اپارٹمنٹس میں دیکھ رہی تھی۔ نووارد لگتا تھا

مگر عجیب بات یہ کہ اپنا سا لگتا تھا- لفٹ رکنے سے پہلے بولی-

''آپ نئے آئے ہیں؟''

''جی---'' اس کی آواز میں جھجک تھی- جو نواردوں کے لہجے میں ہوتی ہے- اور اندر میں حجاب تھا-

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

''پاکستان سے---''

''پاکستان سے---'' زہرا کی چیخ نکل گئی- تبھی یہ آدمی اپنا اپنا سا لگتا تھا- اپنے ملک کے لوگوں میں عجیب سی کشش ہوتی ہے-

''پاکستان کے کس شہر سے---؟''

''لاہور سے''......

''کس سلسلے میں آئے ہیں؟''

''دو سال کی ٹریننگ کے لئے بھیجا گیا ہوں-''

لفٹ رک گئی- وہ دونوں باہر آ گئے-

''اچھا--- مجھے یونیورسٹی کے لئے بس پکڑنا ہے-'' زہرا نے بالکل امریکی لڑکیوں کے انداز میں کہا-

''بہت خوشی ہوئی ایک ہم وطن سے مل کے...... اب تو آپ ہمارے ہمسائے بن گئے ہیں- اکثر ملاقات ہوتی رہے گی-''

''جی...... جی......جی''...... اس نے اسی لجائے ہوئے انداز میں کہا- جس میں احساس کمتری بھی تھا- اور اجنبیت کا احساس بھی---

''بائے---'' وہ اپنی پونی ٹیل ہلاتی ہوئی- اس بس کی طرف دوڑی جو سڑک پر

رک رہی تھی۔

کمال ہے۔ وہ سوچنے لگا۔

میں نے تو اس سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ سارے سوال وہی کر گئی--- کون تھی۔ کہاں کی تھی---؟ ارے--- تھی تو اپنے ملک کی' اس لئے تو کہہ رہی تھی کہ ہم وطن سے مل کر خوشی ہوئی۔ اردو بھی بول رہی تھی۔ لباس امریکن پہنا ہوا تھا۔ تو کیا ہوا--- یہ تو جیسا دیس ویسا بھیس والی مجبوری ہے۔ مگر کیسی صحت منداور چاق و چوبند لڑکی تھی۔ خیر ہے تو پڑوسن۔ پھر وہ پورا ایک ہفتہ نظر نہیں آئی۔

وہ خود بھی ہراساں رہتا تھا۔ نیا نیا آیا تھا۔ کچھ دن ایک سستے ہوٹل میں رہا تھا اور اب ایک بیڈروم کا فلیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک بیڈروم۔ ایک باتھ روم اور ایک ننھا سا کمرہ جو بیک وقت ڈرائنگ روم۔ ڈائننگ روم اور کچن بھی تھا۔ بجلی کے چولہے لگے ہوئے تھے۔ فرنیچر فلیٹ میں شامل تھا۔ سجا سجایا گھر تو مل گیا تھا۔ مگر اب اس نے خود آباد کرنا تھا۔ بھلا کوئی گھر بغیر عورت کے آباد ہوتا ہے--- تبھی تو چھٹی کے روز وہ بیٹھا قیمہ پکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر روز برگر اور میکلڈ انلڈ کھا کھا کے جی اوب گیا تھا۔ آج ہاف کلو قیمہ لایا تھا۔ پیاز اور لہسن بھی--- مکھن بھی--- اور جو کچھ سمجھ میں آیا تھا۔ لے آیا تھا--- مگر یکایک بجلی کے چولہے سے دہائیاں اٹھنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا--- چمڑا جل رہا ہے--- گھبرا کر ڈھکن اٹھایا۔ جلتے قیمے پر پانی انڈیل دیا--- ذرا سے کمرے میں دھواں پھیل گیا۔ پھر اس کو نکالنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا کہ باہر کا دروازہ کھول دے--- دھواں شریف بچے کی مانند باہر نکل گیا...... مطلع صاف ہوا تو اس نے دیگچی میں جھانکا...... دیگچی میں کوئی حسرت نہ بچی تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی وہ گھبرا کر دوڑ آیا۔

وہ لمبی میکسی پہنے، لمبے بال کھولے وہاں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''گڈ مارننگ''۔۔۔وہ بھی بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

وہ زور سے ہنس پڑی۔

''جی فرمایئے!''

''میں اندر آ جاؤں؟''

''آ جایئے''......اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔

وہ مٹکتی لچکتی اندر آ گئی۔

کیسی بیباک ہوتی ہیں۔ یہ امریکہ میں پلنے والی لڑکیاں۔۔۔

''ہاں تو کچھ پکایا جا رہا ہے۔''

''جی ہاں'' وہ جلدی سے بولا۔

وہ چولہے کے قریب گئی۔۔سب دیکھا اور بولی۔

''یہ تو کچھ جلایا جا رہا ہے۔۔۔''

''بس اپنا دل ہی جلا رہا ہے۔۔۔''

''اچھا تو''......وہ اپنی غلافی آنکھیں کھول کر بولی:

''اس دیگچی میں آپ کا دل پک رہا تھا۔ افوہ، پھر تو بیچارہ جل گیا، سارے کا سارا۔۔۔اب کیا کریں گے آپ۔''

اور قریب آ گئی۔۔۔اتنی کہ اس کی خوشبو اس کے نتھنوں کو چھونے لگی۔۔۔''دل کے بغیر کیسے زندہ رہیں گے آپ۔۔۔کیسے، بتائیں نا؟''

اس نے اتنی زور سے پوچھا۔۔۔کہ وہ ڈر کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔۔۔مگر اس بے باک لڑکی کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں جانے کیا تھا۔۔۔وہ پاگلوں کی طرح بس

اسے دیکھتا رہ گیا- پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی-''

''یہاں جو بھی ''چھڑا'' آتا ہے- اس کا یہی حال ہوتا ہے-''

''پھر وہ پیچھے ہٹ گئی اور سارے کمرے میں گھوم پھر کر بولی-

''کیا نام ہے آپ کا بائی داوے---''

''جی......زنیر احمد صدیقی-''

''ہاں تو زنیر احمد صدیقی صاحب' نام آپ کا مشکل بھی ہے اور لمبا بھی ہے- امریکہ میں اتنے لمبے نام بلانے کا رواج نہیں ہے- آپ چونکہ نئے نئے آئے ہیں اس لئے اسکول کے بچوں کی طرح پورا نام بتاتے ہیں- کچھ دنوں تک آپ اپنے کمرے کے باہر کچھ اس قسم کی تختی لگا دیں گے- زیڈ- اے صدیقی ---اور'' سب آپ کے واقف کار آپ کو مسٹر صدیقی کہیں گے- ٹھیک ہے نا؟''

''جی ٹھیک ہے-'' وہ اتنی ہی سعادت مندی سے بولا-

اس پر زہرا نے پھر بلند سا قہقہہ لگایا- کیسا جاندار قہقہہ تھا- حوصلے کی فصیلیں توڑ رہا تھا-

''بات یہ ہے کہ--- میرا نام بھی زیڈ سے شروع ہوتا ہے- ارے آپ نے تو ابھی تک میرا نام ہی نہیں پوچھا-''

''بس پوچھنے والا تھا-''

''افوہ! آپ لوگ اتنے بزدل کیوں ہوتے ہیں- لڑکی دیکھ کر دبک جاتے ہیں- آخر پوچھیں نا! میرا نام---؟''

''جی آپ کا نام کیا ہے---؟'' وہ ہونقوں کی طرح بولا-

''یہ جی--- کیا ہوتا ہے؟''

''جی''...... پھر وہ رک گیا- سر کھجایا- اور زور سے ہنس پڑا-

''آپ بہت تیز ہیں- بیٹھئے؟'' کرسی کی طرف اشارہ کیا- وہ بیٹھ گئی تو خود بھی بیٹھ گیا-

''آپ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں؟''

''پہلی بار امریکہ آیا ہوں-''

''تو کیا ہوا- مرد ہیں- ہوشیار بنیں-''

''آپ کی صحبت میں رہوں گا تو ہوشیار ہو جاؤں گا-''

''شاباش! پہلی بار کام کی بات کی ہے آپ نے-''

''ہاں تو--- میں کہہ رہی تھی...... جی آپ نے میرا نام پوچھا تھا- میرا نام زہرا ہے-''

''بالکل پاکستانی نام ہے---''

''تو کیا میرا نام پاکستانی نہیں ہونا چاہیے تھا-''

''آپ امریکہ میں رہتی ہیں- تو میں نے جانا کوئی میری، جیکی یا جینی قسم کا نام ہو گا آپ کا!''

''جی نہیں آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرا پورا نام زہرا فاطمہ ہے- میں پاکستان میں پیدا ہوئی تھی- پھر میرے پاپا مستقل یہاں آ گئے- تو ہم سب کو آنا پڑا-''

''آپ کے پاپا جی کیا کرتے ہیں---؟''

''ساری باتیں آج نہیں بتاؤں گی-''

''کب بتائیں گی---؟''

''قسطوں میں--- آج تو آپ کے کمرے سے نکلنے والی خوشبو مجھے یہاں لے

آئی ہے۔ میں آپ کو بتانے آئی تھی کہ یہاں اردگرد امریکی رہتے ہیں۔ وہ مصالحہ جلنے کی خوشبوئیں پسند نہیں کرتے۔ احتجاج کر سکتے ہیں۔ ایسے تجربے دروازہ بند کر کے کیا کریں، بلکہ امور خانہ داری کو ہاتھ ہی نہ لگائیں۔ اسی میں آپ کی بہتری ہے۔"

"تو کیا کروں---؟ باہر کا کھانا کھا کھا کر تھک گیا ہوں۔"

"آپ نے وہ "کن ٹکی چکن" ٹرائی کیا ہے---؟"

"وہ بھی کتنے دن کھا سکتا ہوں؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے---" وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔" آپ کے لئے کچھ سوچنا پڑیگا۔"

پھر کھڑی ہوگئی اور بولی۔

"آپ کا نام بہت مشکل ہے---"

"تو آپ اسے آسان کر دیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔"

"مجھے یہاں سب زارا کہتے ہیں۔ اس لئے میں آپ کو نیرو کہہ کر بلاؤں گی۔ پسند ہے۔"

"دل و جان سے" وہ ہنس کر بولا۔

"اچھا اب آپ دروازہ بند کر لیں۔"

وہ گھوم کر مڑی اور تین انگلیاں ہلا کر بائے بائے کیا اور باہر نکل گئی۔

آفت قسم کی شے تھی۔ زنیر احمد نے ایک لمبی سانس چھوڑی۔ مگر پیاری تھی۔ لڑکیاں امریکہ میں رہ کر بے باک ہو جاتی ہیں۔ یہ اسے آج ہی پتہ چلا تھا۔ ویسے تو اس کے دفتر میں کئی امریکی لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ جن سے انگریزی میں بات کرتے ہوئے وہ جھینپتا

تھا- زارا سے اپنی زبان میں بات کر کے مزہ ہی اور آتا تھا--- زارا کا پورا خاندان امریکہ میں چلا آیا تھا-

پندرہ سال پہلے اس کے والد آئے تھے- اس وقت وہ پاکستان میں چمڑے کی مصنوعات بناتے تھے- یہی مصنوعات لے کر وہ امریکہ کے مختلف شہروں میں جایا کرتے تھے- اس کے ساتھ ہی انہوں نے قالینوں کی ایکسپورٹ بھی شروع کر دی- جب کام بہت زیادہ بڑھ گیا تو اپنے دونوں بیٹوں کو ساتھ ملا لیا--- رفتہ رفتہ پورا خاندان امریکہ چلا آیا- یہاں واشنگٹن ڈی سی میں ان کا بہت خوبصورت گھر تھا- ایک بڑا شوروم تھا- ایک بھائی نے امریکی لڑکی سے شادی کر لی تھی- اور دونوں ایک ریستوران چلاتے تھے- دوسرا بھائی پاکستانی لڑکی سے شادی کر کے آیا تھا- اور باپ کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا- دو بڑی بہنیں بھی تھیں- مگر اب دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں- ان کی شادیاں بھی ایک مسئلہ بنی رہی تھیں--- پاپا جی چاہتے تھے کہ انہیں پاکستان میں جا کر بیاہا جائے- اس کام کے لئے امی جان ہر سال پاکستان جاتی تھیں- شکر ہوا کہ عزیزوں میں ہی دو اچھے لڑکے مل گئے- اور ان کی شادیاں ہو چکی تھیں- ایک پنڈی میں تھی اور دوسری کراچی میں--- پاپا جی تو سال میں دو چکر پاکستان کے لگاتے تھے مگر می جان ہمیشہ دو تین سال کے بعد جاتی تھیں- تب زارا بھی ان کے ساتھ چلی جاتی تھی- اب می کو زارا کے لئے اچھے لڑکے کی تلاش تھی- اگر کبھی امریکہ میں کوئی پاکستانی لڑکا نظر آ جاتا تو می جان--- بڑی سرعت سے اس کا آگا پیچھا معلوم کرنے پر لگ جاتی تھیں- زارا سب بچوں میں چھوٹی بھی تھی اور لاڈلی بھی تھی- اس کا تو بچپن بھی امریکہ میں گزرا تھا- اس لئے امریکی لڑکیوں کی طرح بے تکلف اور خوش مزاج تھی- آج کل اس نے میری لینڈ کی یونیورسٹی میں داخلہ لے رکھا تھا- یہ یونیورسٹی واشنگٹن شہر سے کافی دور تھی- اس لئے وہ یہاں ایک اپارٹمنٹ لے کر رہ

گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ایرانی لڑکی رہتی تھی۔ جو کسی دفتر میں ملازم تھی۔ ہفتہ اور اتوار کے روز زارا واشنگٹن ڈی۔ سی اپنے والدین کے پاس چلی جاتی تھی۔ کبھی کبھی ممی یا پاپا بھی اس کے پاس آ جاتے تھے۔

اس روز زارا بہت دن کے بعد نظر آئی تو زنیر نے اسے نیچے لابی میں ہی روک لیا اور بولا۔

''آپ نے کہا تھا۔ آپ میرے لئے کچھ سوچیں گی!''

''کیا۔۔۔؟'' زارا نے اپنی وحشی جیسی کشادہ آنکھیں کھول کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ ہاتھ میں برگر پکڑا ہوا تھا۔۔۔ جسے بے تحاشا دانتوں سے کاٹ کے کھا رہی تھی۔

''اچھا تو آپ کا حافظہ بھی کمزور ہے۔'' وہ اور شوخ ہو گیا۔ ''اب تو آپ غالباً مجھے بھی بھول چکی ہوں گی۔ کون ہوں۔ اور نام کیا ہے۔۔۔؟''

''زنیر احمد صدیقی عرف نیرو...... میں واقعی آپ کے بارے میں سوچنا بھول گئی تھی دراصل میرے سمیسٹر ہو رہے تھے۔ اور فیروزہ بیمار تھی۔ سارا گھر کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔''

''فیروزہ کون ہے۔۔۔؟''

''ارے آپ کو معلوم نہیں فیروزہ میری ہاؤس میٹ ہے۔ ہم دونوں مل کر اس اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔''

''آپ نے اس روز تو مجھے بتایا نہیں تھا۔''

''اس روز کیا کیا بتاتی آپ کو۔۔۔؟''

''اچھا تو اب بتا دیجئے۔۔۔''

''زارا نے پورا برگر ختم کر کے کاغذ کے نیپکن سے منہ اور ہاتھ صاف کئے اور پھر اس

کاغذ کو دور پڑے ہوئے ڈرم میں پھینک دیا اور اپنی پونی ٹیل ہلاتی ہوئی آئی اور بولی۔

''فیروزہ ایک ایرانی لڑکی ہے۔ میری دوست ہے۔ میرے ساتھ رہتی ہے۔ مگر وہ جاب کرتی ہے۔ ایک ڈائمنڈ شاپ پر سیلز گرل ہے۔۔۔ بس ہمارے آنے جانے کے اوقات میں فرق ہے۔ اس لئے آپ نے اسے میرے ساتھ نہیں دیکھا۔ کسی روز ملاقات کرادوں گی۔''

''جی میں ان سے ملاقات کا اتنا شوقین نہیں ہوں۔''

''آپ کس بات کے شوقین ہیں؟''

''ابھی تک میرا مسئلہ حل نہیں ہوا۔۔۔''؟

زارا نے ایک لمبی ہوں کی۔ اور پھر راک اینڈ رول کی طرز پر گھوم گھوم کر سوچنے لگی۔ اور پھر بولی۔

''حل ہوسکتا ہے آپ کا مسئلہ۔۔۔''

''وہ کیسے'' وہ بیتابی سے بولا۔

''کھانا کھانا چھوڑ دیجئے۔۔۔''

اس پر دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

''چھوڑ دوں۔۔۔ اور مر جاؤں''

''ارے اتنے کمزور ہیں آپ۔۔۔''

''پہلے ہی دیکھئے میری صحت کتنی خراب ہوگئی ہے۔''

''مجھے تو کہیں سے بھی خراب نہیں لگتی۔'' اس کو سر سے پیر تک دیکھ کر بولی۔۔۔'' بس ٹھیک ٹھاک ہیں آپ۔۔۔ ہاں وہ جو پاکستان سے آتے ہوئے ذرا سی توند نکلی ہوئی تھی۔ وہ پگھل گئی ہے۔۔ اب تو آپ پہلے سے زیادہ اسمارٹ لگ رہے ہیں۔

زنیر بلش کر گیا-

حالانکہ وہ اس کے شعلہ صفت چہرے اور بیباک آنکھوں کی تعریف کرنا چاہتا تھا- الجھ گیا- تو پھر جلدی سے بولا---

"آپ کے سمیسٹر ختم ہو گئے-"

"کرسمس سے پہلے---"

"جی ہاں---"

"اگلے سمیسٹر کب ہوں گے---؟"

"پھر...... پھر آپ کی تعلیم ختم ہو جائے گی-"

"تعلیم تو کبھی ختم نہیں ہوتی مسٹر--- جتنا مرضی پڑھتے جاؤ-"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے-"

"اور آپ کیا پڑھیں گی؟"

"ایم-ایس تو ہو جائے گا اب--- مگر مزید نہیں پڑھوں گی جاب کروں گی-"

"یہاں تو لوگ جاب کرنے کے بہت دلدادہ ہیں-"

"تو کیا کریں---؟ یہاں جاب کئے بغیر وقت نہیں گزرتا' اخراجات بہت زیادہ ہیں اور ہر ذی روح اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتا ہے- اور خودمختارانہ زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی برسر روزگار بھی ہو---"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے-"

اب اور کیا بات کرے--- زنیر سر کھجانے لگا تو وہ جلدی سے او کے- بائے کہہ کر چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی-

............☆............

اگلے ویک اینڈ پر جب وہ اور فیروز بہت سے لفافے اٹھائے اپنے کمرے میں جا رہی تھیں۔ تو وہ کمرے کو تالا لگا کر باہر نکل رہا تھا۔

''ہیلو......ان کو دیکھ کر مسکرایا۔

''اسلام علیکم---'' زارا نے خوش دلی سے کہا۔ پھر سارے بوجھل لفافے اپنے کمرے کے مقفل دروازے کے ساتھ رکھ۔ بولی۔

''یہ فیروزہ ہے---میری دوست---''

پھر فیروزہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

''فیروزہ ان سے ملو۔ یہی از مائی فرینڈ نیرو۔ یہ ابھی پاکستان سے آئے ہیں۔'' زارا کے اس فقرے سے زنیر کا دل دھڑک اٹھا---فیروزہ نے اپنا گورا گورا ہاتھ بڑھا دیا تو زنیر نے بھی گرمجوشی سے ہاتھ ملا ڈالا۔

''دو تین رسمی فقروں کے بعد---زارا جلدی جلدی دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔''

''آپ کہاں جا رہے تھے---''

''باہر جا رہا تھا کھانا کھانے۔''

''آج گھر میں نہیں پکایا---''

اس پر زنیر بے تحاشا ہنسنے لگا۔

''سارے تجربے ناکام ہو گئے ہیں۔''

''کیوں فیروزہ---'' اس نے مڑ کر فیروزہ سے پوچھا۔

''آج نیرو کو اپنے گھر دعوت نہ کھلائیں۔''

''ضرور کھلاؤ---'' فیروزہ بنڈل اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔

''نہیں......نہیں......اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔'' زنیر نے واقعی تکلف محسوس

کرتے ہوئے کہا۔

''بھی ہم کوئی خاص اہتمام نہیں کریں گے۔ آج ہم ہفتے بھر کا سودا خرید کر لائے ہیں۔ فیروزہ کوفتے پکائے گی اور میں مٹر کا پلاؤ۔''

''اصل میں ہم صرف ہفتہ اور اتوار کو اپنے اپنے ملک کا کھانا پکاتے ہیں۔ روز تو جو بھی مل جائے گزارا کر لیتے ہیں۔''

''آپ دونوں کا شکریہ بہت بہت---'' وہ انکساری سے بولا۔ ''میں بالکل آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتا''......

''ایک تو آپ پاکستانی لوگ تکلف بہت کرتے ہیں'' - فیروزہ نے چڑ کر کہا۔ ''یا پتہ نہیں Hypocracy کرتے ہیں۔''

''سن لیا آپ نے---'' زارا نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ ''اتنی سی بات تھی کہ آپ جھٹ کہہ دیتے۔''

''شکریہ خواتین' میں ضرور آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔ بلکہ آپ دونو جوان حسین لڑکیوں کے ساتھ کھانا کھانے میں فخر محسوس کروں گا۔''

''جی---'' زنیر شرمندہ ہو گیا...... ''تو ایسا کہتے ہیں؟''

''اور کیسا کہتے ہیں۔ دل سے تو آپ چاہ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔ گپ لگائیں اوپر سے تکلف فرما رہے ہیں۔''

''آپ نے کیسے جانا---؟'' زنیر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ کیوں کہ یہ سچ تھا۔

''بس میں اپنے ہم وطن لوگوں کو جانتی ہوں۔ تھوڑی سی Hypocracy کیے بغیر نہیں رہ سکتے تکلف کا اظہار رسماً کرتے ہیں۔ کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ دیکھو کتنے بھوکے

ہیں-فٹ مان گئے-''

''ہے نا---؟''

زنیر اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا-

''اسی لئے تو یہ امریکی لڑکے اچھے ہوتے ہیں- وقت ضائع نہیں کرتے- اپنے جذبات کا صاف اظہار کرتے ہیں-''فیروزہ نے کہا-

''زارانے زنیر کو چپ دیکھ کر ذرا لہجہ نرم بنایا اور بولی-

''اپ کیا سوچ رہے ہیں---؟''

''اصل میں آپ نے ٹھیک کہا-میں آپ کے ساتھ کھانا کھانا ایک اعزاز سمجھتا ہوں مگر ویسے ہی رسماً تکلف کر رہا تھا---''

''اچھا تو پھر کیا طے ہوا---''زارا بولی-

''آجاؤں گا---مگر کس وقت---''

''ٹھیک سات بجے شام---''

''شکریہ---''زنیر نے جھک کر کہا-''ٹھیک سات بجے شام میں حاضر ہو جاؤں گا-''

ٹھیک سات بجے شام اپنی بند مٹھی کی پشت سے زنیر احمد نے دروازے کے باہر دستک دی تو ایپرن کھولتی ہوئی فیروزہ دروازے کی طرف دوڑی---

''وہ آ گیا تمہارا عاشق صادق---''وہ زیر لب بڑبڑائی-

''بکو نہیں فیروزہ---''زارا نے بھی بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے کہا-''اس کے سامنے ایسی بکواس نہ کرنا-یہ لوگ اور طرح کے ہوتے ہیں-''

''میں جانتی ہوں منافق ہوتے ہیں-''

''خبردار جو ہمارے وطن کے لوگوں کو منافق کہا- بیچارے سیدھے سادے سادہ دل ہوتے ہیں-مکروفریب نہیں جانتے-''

''ہاں میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں ان کو---کبھی غور کیا' تمہاری طرف کیسے دیکھتا ہے---''

''الو کی دم دروازہ تو کھولو---''

زارا نے دانت پیس کر کہا-

تو فیروزہ نے ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ جما کر دروازہ کھولا اور راستہ چھوڑ کر بولی-

''ویلکم سر---خوش آمدید---''

''جھجکتا ہوا زنیر اندر داخل ہوا- یہ اپارٹمنٹ بھی اسی کے اپارٹمنٹ کے مانند تھا- صرف کچن کا رخ دوسری جانب تھا- میز پر برتن رکھے تھے- اور مٹر پلاؤ کی بڑی اشتہا انگیز خوشبو نکل رہی تھی-

''بیٹھئے'' ......

زارا نے اسے کرسی پر بٹھا دیا--- اور پھر دوڑ دوڑ کر چٹنی اور اچار کی بوتلیں اس کے آگے رکھنے لگی- زنیر احمد کو دو مہینے ہو گئے تھے اپنے گھر سے نکلے ہوئے- آج اسے احساس ہوا کہ گھر کیا ہوتا ہے-

''اور عورت کے ہونے میں کیا دلکشی ہے-عورت شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ --- وہ ایک منتظم گھر ہوتی ہے- اس کے پاس محبت اور شفقت کے علاوہ بھی دینے کو بہت کچھ ہوتا ہے- کتنا اچھا لگ رہا تھا' ان کا گھر--- اور ان کے گھر میں بیٹھ کر کھانا--- ہم اپنے گھروں میں عورتوں کو کس قدر فضول اور غیر ضروری سی شے تصور

کرتے ہیں---زنیر احمد سوچنے لگا-

اتنے میں وہ دونوں میز پر آ کر بیٹھ گئیں-

زارا سوپ کے گرم گرم پیالے لائی---تو فیروزہ ایک دم شرارت سے چمک کر بولی-

''مسٹر نیرو-آپ اور کچھ پئیں گے-''

''کچھ اور کیا---''؟ زنیر نے معصومیت سے منہ اٹھا کر پوچھا---پھر اس کی آنکھوں میں مچلتا سوال پڑھ کر خفت سے ہنس پڑا- اور بولا''......نہیں یہی سوپ چلے گا---''

''دیکھیں تکلف نہ کریں- یہ امریکہ ہے- یہاں سب چلتا ہے-'' مسکرائی اور ادا سے بولی-

''آپ پاکستانی لوگ کبھی دل کی بات نہیں بتاتے- ہمیشہ پردہ ڈال کر بات کرتے ہیں- ہم بالکل برا نہیں مانیں گے- ہمارے ہاں تو امریکن اور یورپین مہمان بھی آتے ہیں- ہمارے ملے جلے دوست ہیں- اس وقت گھر میں بیئر ہے- اگر آپ کہیں تو میں پیش کر سکتی ہوں-''

''نہیں---'' زنیر ایک دم بولا---''نہیں---واللہ میں نہیں پیتا' نہ عادت ڈالنا چاہتا ہوں- ورنہ آپ لوگوں سے کیسی شرم---؟''

اس پر زارا نے فخریہ انداز میں فیروزہ کی طرف دیکھا اور سوپ پینے لگی- زنیر نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور جی بھر کر کھانے کی تعریف کی- اور انہیں صاف صاف بتا دیا کہ دو مہینے بعد آج اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے......خوب گپ شپ ہوتی رہی- بعد میں فیروزہ اٹھ کر ایرانی قہوہ بنا لائی- تھوڑی ہی دیر میں تینوں اتنے گھل مل گئے کہ...زارا

بولی---

''فیروزہ کیوں نہ مل کر نیرو کا مسئلہ حل کر دیں-''

''کونسا مسئلہ---! فیروزہ نے پوچھا-

''وہی کھانے کا مسئلہ-''

''ہاں''...... فیروزہ جمائی لے کر بولی-''ہے کوئی تجویز تمہارے ذہن میں---''

''ہاں میں نے سوچا ہے کہ ہفتہ اور اتوار کے روز ہم تینوں مل کر کھانا پکایا کریں گے- اور مل کر کھایا کریں گے---اس طرح ملاقات بھی ہوتی رہے گی' اور ان کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا-''

''ٹھیک ہے زارا--- کچھ تھوڑا سا کام یہ بھی سیکھ جائیں گے-''

''کیوں مسٹر نیرو''...... فیروز نے زنیر کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا-

''جی...... میں...... میں...... جی---''

فیروزہ بیچ میں بولی-''اب یہ پھر منافقت کریں گے اور پھر کچھ مختلف قسم کے فقرے کہنا چاہیں گے-''

پیشتر اس کے کہ زارا بھی کچھ کہے-

آہستہ سے بولا-''میری اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے---''

......اس پر دونوں لڑکیاں قہقہے لگا کر ہنسنے لگیں-تھوڑی دیر تک ان کو دیکھنے کے بعد زنیر بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا-

............☆............

ویک اینڈ بہت دلچسپ گزرنے لگا- پہلے تو تینوں مل کر ہفتے کے روز سودا لینے جاتے پھر مینو بنایا جاتا- دونوں لڑکیاں ککنگ کرتیں اور زنیر ان کی مدد کیا کرتا' بلکہ وہ ساتھ

ساتھ اسے کھانا پکانے کی تراکیب بھی سکھایا کرتیں اور زنیر سوچا کرتا--- جب سے وہ پیدا ہوا ہے- گھر میں ایک جیسے کھانے کھا رہا ہے- اس نے ایک بار بھی تو نہیں سوچا تھا کہ ایسے معمولی قسم کے کھانے پکانے میں عورتوں کو کتنا تردد کرنا پڑتا ہوگا- بار بار ایک کام کرنا پڑتا ہے- پیاز ہی کو لے لیجئے--- دن میں جتنی مرتبہ کھانا پکائیں اتنی مرتبہ کاٹنا پڑتا ہے--- اگر مردوں کو گھر میں ایک کام بار بار کرنا پڑے تو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں- اپنا بچہ کسے پیارا نہیں ہوتا- مگر بار بار بچے کو غسل خانے لے جانا پڑے یا اس کی نیکر بدلنی پڑے تو مرد کو کتنا غصہ آتا ہے اسے یہ سب کام گھٹیا لگتے ہیں- جنہیں صرف عورت کرسکتی ہے-

واقعی اگر عورت نہ ہوتی تو یہ دنیا کس طرح آباد ہوتی- مرد تو بس مسند نشین شہنشاہ بن کر بیٹھ جانا چاہتا ہے---

اور بھی بہت سے پردے ہٹے تھے- زنیر احمد کی آنکھوں سے-

ایک روز اچانک زارا کی ممی آ گئیں- زارا نے بغیر کسی قسم کی جھجک کے زنیر احمد کو اپنی ممی سے ملوا دیا--- اب زارا کی ممی کی ایک مجبوری تھی- ہر آدمی کو یوں جانچا کرتیں- جیسے داماد ڈھونڈنے نکلی ہوں- خصوصاً اگر نوارد پاکستان کا ہوتا تو بالکل سی- آئی- ڈی کا محکمہ بن جاتیں-

دو دن وہ زارا کے اپارٹمنٹ میں رہیں- دونوں دن شام کو زنیر احمد کے اپارٹمنٹ میں چلی جاتیں اور کرید کرید کر سوالات کرتیں---

''تمہارے والدین کہاں کے رہنے والے ہیں بیٹا-''

''جی! وہ تو سرگودھا کے رہنے والے ہیں-''

''اور دادا دادی---

''جی مجھے کچھ اچھی طرح یاد نہیں۔ بس ہندوستان سے ہجرت کر کے سارا گھرانہ سرگودھا آ بسا تھا۔ غالباً وہاں لدھیانہ میں رہتے تھے۔''

''وہاں کچھ زمینیں وغیرہ بھی ہوں گی۔۔۔''

''مجھے کچھ معلوم نہیں جی۔۔۔''

''معلوم تو اس طرح ہوتا ہے بیٹا۔ اگر پاکستان آ کر تمہارے دادا دادی کو زرعی زمین یا کوئی جائیداد ملی ہو جو انہوں نے آگے اپنے بچوں میں تقسیم کی ہو تو صاف اندازہ ہو جاتا ہے۔''

''جی شکر گڑھ کی طرف ہماری تھوڑی سی زمین ہے۔ میرے دادا زمینداری کرتے تھے۔ مگر ابا جی تعلیم کے سلسلے میں لاہور آ گئے تھے۔ پھر وہ وہیں ٹک گئے۔ وہیں شادی کر لی۔ ہم سب لاہور میں پیدا ہوئے۔ اپنے آپ کو لاہور ہی کے شہری سمجھتے ہیں۔''

''کتنے بہن بھائی ہیں آپ لوگ۔۔۔؟''

''جی ہم سات بہنیں اور دو بھائی ہیں۔''

''ماشاءاللہ بہت بڑا کنبہ ہے۔۔۔''

''کتنے لوگ شادی شدہ ہیں۔''

''میری پانچ بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔''

''ماشاءاللہ۔۔۔ بڑی ہوں گی تم سے''

''جی ہاں''......

''باقی دو مجھ سے چھوٹی ہیں۔ مگر دونوں کے نکاح ہو چکے ہیں۔ اب میں جاؤں گا تو رخصتی ہو جائے گی۔''

''اور تمہارا دوسرا بھائی۔۔۔''

''جی وہ ابھی بہت چھوٹا ہے-یعنی بارہ برس کا ہے-''

''بارہ برس کا!'' ممی حیران ہوتیں- پھر مسکرا کر بولیں-''اچھا...... اچھا تمہاری ممی چاہتی ہوں گی-تمہارا کوئی دوسرا بھائی ہو-اچھا......اچھا''......

تھوڑی دیر الٹ پلٹ سے سوال کر کے پھر...... وہ زنیر احمد کے رشتے داروں کی طرف آ جاتیں-کون کون کس کس عہدے پر ہے اور زنیر احمد صاف صاف سب کچھ بتا دیتا- جو کچھ پوچھتی تھیں- وہ بتانا تو اس کا فرض تھا نا؟

''دو دن زنیر احمد کا ٹھونک بجا کے انٹرویو لینے کے بعد---ممی چلی گئیں-مگر جاتے جاتے زارا سے کہہ گئیں-''اس بیچارے کا خیال رکھا کرو-''

فیروزہ نے زارا کو آنکھ ماری-

بعد میں بولی ''لڑکا تمہاری ممی کو پسند آ گیا ہے-تمہاری ممی کو تو لڑکے پسند کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے- جب تمہاری شادی ہو جائے گی-تو پھر ممی کیا کریں گی بیچاری---ان کو ادارہ خدمت خلق کھول لینا چاہیے---''

اس پر دونوں ہنسنے لگیں-

ممی نے جا کر ڈیڈی سے بھی یہی کہا ہے-

''اچھا لڑکا ہے- کھاتے پیتے لوگوں کا بیٹا ہے- دو سال کی ٹریننگ پر آیا ہے- وہ تو خیر کوئی مسئلہ نہیں---شادی کے بعد لڑکی چاہے تو اس کی مہار موڑ کر اسے بھی ہمیشہ کے لئے امریکہ لے آئے-''

''اب تم کیا چاہتی ہو---؟''

ڈیڈی نے بیزاری سے کہا-

''توبہ ہے- میں تو ایک بات کہہ رہی تھی آپ سے-''

''ایسی کئی باتیں تم مجھے پہلے بھی کہہ چکی ہو۔''

''ہاں تم باپ ہونا؟ اس لئے تم ماں کی طرح نہیں سوچ سکتے۔''

''یہ زمانہ ماں باپ کے سوچنے کا نہیں''---ڈیڈی نے پائپ کا کش لے کر کہا۔''بچے خود اپنے بارے میں بہتر سوچ لیتے ہیں۔ زہرا بچی نہیں---اس کو خود فیصلہ کرنے دو۔''

''ہونہہ---وہ تو ایم۔ ایس کے بعد نوکری کرنے کا سوچ رہی ہے۔''

''تو نوکری کر کے بھی شادی ہو سکتی ہے۔''

''تم تو بالکل امریکن ہو گئے ہو---''ممی برا مان گئیں۔

''ڈارلنگ! تم اپنے ہی بارے میں سوچے جا رہی ہو۔ اس لڑکے کے بارے میں سوچو' آیا شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ--- وہاں اس کی منگنی یا نکاح تو نہیں ہو چکا---ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کر لے گا۔ زارا کو پسند کرتا ہے یا نہیں۔''

''بس......بس......ممی اٹھ گئیں۔ تم مرد کی نگاہ کو کیا پہچان سکتے ہو۔ تم مرد تو اپنے آپ میں مگن رہتے ہو۔ مرد کی نگاہ صرف عورت پہچانتی ہے۔ خواہ کسی عمر کی عورت ہو۔''

............☆............

''آپ ابھی تک بس میں آجا رہے ہیں۔ ایک کار کیوں نہیں خرید لیتے---؟''
زارا نے سڑک پر زنیر احمد کو اترتے دیکھ کر کہا۔

''کار کیسے خرید لوں---؟''

''یہاں امریکہ میں کاریں بہت سستی ہیں۔ خصوصاً سکینڈ ہینڈ کاریں تو ایک سو یا دو سو ڈالر میں بھی مل جاتی ہیں۔ خرید لیں جاتے ہوئے بیچ جایئے گا۔''

''مگر مجھے تو یہاں کے ٹریفک کی ہی سمجھ نہیں آتی---؟''

''سب آ جائے گی۔''

''یہاں موٹر چلانا تو بہت مشکل لگتا ہے۔''

''جی نہیں--- یہاں ٹریفک کا نظام اتنا منظم ہے کہ یہاں موٹر چلا کر مزہ آ جاتا ہے۔ میں تو بلکہ پاکستان میں موٹر نہیں چلا سکتی۔ واقعی ہاں--- اس بد نظمی میں موٹر چلانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔ موٹر چلاتا جاتا ہے۔ چند بڑی سڑکوں کے علاوہ جہاں ٹریفک کنٹرول سسٹم ہے۔ باقی ہر جگہ بڑی بد نظمی ہوتی ہے۔''

''مگر ہمیں تو اس نظم میں خوف آتا ہے۔ یہاں سڑکوں پر اتنے اشارے لکھے ہوئے ہیں۔ ذرا سی غلطی پر پکڑے جائیں گے۔ ایسا لگتا ہے۔ ٹریفک پر سپاہی نہیں فرشتے مقرر ہوں۔''

''یہ تو آپ نے ٹھیک کہا۔ یہاں آپ ذرا سی کوتاہی بھی نہیں کر سکتے - اگر بھول چوک ہو جائے گی' تو فوراً دھر لئے جائیں گے۔ اسی لئے تو یہاں لوگ ٹریفک کے قوانین کا بہت احترام کرتے ہیں۔''

''ہاں تو آپ مجھ اناڑی کو پھنسانا چاہتی ہیں۔''

دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ زارا ابھی ابھی یونیورسٹی سے آئی تھی اور سڑک پر کھڑی تھی۔ زرا دوران کا اپارٹمنٹ تھا۔ دونوں کا رخ اپارٹمنٹ کی طرف تھا۔ ''نہیں میں آپ کو پھنسانا نہیں چاہتی۔ چاہتی ہوں امریکہ آئے ہیں۔ تو کچھ دن اچھے گزاریں۔ سیر سپاٹے کریں۔ کچھ سیکھیں۔ بیشک دفتر بس میں ہی جائیں' مگر چھٹیاں تو اچھی گزریں--- جب کہ آپ کو اچھا خاصا الاؤنس مل رہا ہے---''

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں؟''

''تو صبح کا اخبار دیکھنا شروع کریں نا؟''

''کون معاملہ طے کرے گا-''

''فون کر کے دیکھئے---ڈیلر خود آپ سے ملنے آ جائے گا-''

''مگر میں تنہا ان سڑکوں پر پھنس جاؤں گا-''

''دیکھئے--- میں اور فیروزہ باری باری آپ کے ساتھ ڈرائیونگ پر جایا کریں گے-اور آپ کو سڑکوں کے نام---اور ٹریفک کے سارے اصول سمجھا دیں گے-''

''ٹھیک ہے؟''

''بلکہ یہ تو بہت اچھا ہے-ورنہ میں بہت ڈر رہا تھا-''

''آخر آپ لوگ اتنے ڈرپوک کیوں ہوتے ہیں؟''

''ڈرپوک نہیں ہیں ہم--- شاید ہمیں احساس کمتری ہے کہ ہم ایک غریب ملک کے رہنے والے ہیں-''

''ہر قوم کے باشندے کے پاس عزت نفس ہونی چاہئے اور اسے یہ سوچ کر ملک سے باہر آنا چاہئے کہ وہ اپنے ملک کا نمائندہ ہے اور بہتر کارکردگی اور دیانتداری سے اپنے ملک کا نام اونچا کرے گا-اس کے بعد تو احساس کمتری کا جواز نہیں رہتا' محنت کرنا' مشقت کرنا اور عزت کی روٹی کھانا کوئی بری بات نہیں-اب دیکھیں نا؟ امریکہ اور یورپ کتنے امیر ملک ہیں-ساری دنیا نے ان کے آگے ہاتھ پھیلا رکھا ہے-مگر انہی ملکوں کے باشندے ہمارے جیسے غریب ملکوں میں کیا لینے جاتے ہیں-ان کو بھی روزگار وہاں لے جاتا ہے-ایک بات یاد رکھیں-نیرو صاحب! دیانت دار اور محنتی آدمی کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوسکتا-ہمارا ماضی شاندار رہا ہے-ہمیں شاندار کام کرنے چاہئیں-غریب ہونا معیوب نہیں---بد دیانت ہونا معیوب ہے-آپ کو علم ہے---کہ ہمارے یہاں صلاحیتوں کی کمی نہیں---؟''

زنیر نے حیرت سے پلٹ کر زارا کی طرف دیکھا اور مزید حیران ہو کر بولا۔

''کمال ہے آپ امریکہ میں رہتے ہوئے اپنے وطن سے محبت کرتی ہیں۔''

''بھئی وطن تو وطن ہوتا ہے۔''--- وہ ہنس کر بولی۔ ہم جس زمین پر بھی رہیں۔ ہمارے اندر وطن کی خوشبو رہے گی۔ بے ضمیر لوگ اپنے وطن کو بھول جاتے ہیں۔ یا اس پر کیچڑ اچھالتے ہیں---''

''کاش آپ پاکستان میں ہوتیں؟''

''اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میں جہاں بھی ہوں۔ میں پاکستانی ہی ہوں' بلکہ میرا اس جگہ پر رہنا زیادہ بہتر ہے۔''

''کیوں---؟''

''کیونکہ ان ملکوں میں بھی کچھ ضمیر فروش ہموطن آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ جو اپنی گھٹیا حرکتوں سے ہر جگہ پاکستان کو بدنام کرتے ہیں۔ ایسے میں ہم آگے ہو کر واضح کرتے ہیں کہ ہم ویسے نہیں' ایسے ہیں۔''

''آپ نے تو آج بالکل نئی باتیں بتائی ہیں؟''

''آپ نئے نئے آئے ہیں نا؟ کچھ نہیں جانتے...... میں آہستہ آہستہ آپ کو کچھ ہموطنوں سے ملاؤں گی--- جن سے مل کر آپ کو واقعی افسوس ہوگا--- کیونکہ وہ اپنا دین' ایمان سب ڈالر کو سمجھنے لگے ہیں اور ڈالر کی خاطر گھٹیا سے گھٹیا کام بھی کر سکتے ہیں۔''

''واقعی---؟''

''جی ہاں---اور مجھے وہ لوگ بہت برے لگتے ہیں۔ جو فیشن کے طور پر اپنے ملک یا اپنے ملک کی مصنوعات کو برا کہتے ہیں۔ اور خواہ مخواہ اپنے ملک کا مقابلہ بڑے بڑے ملکوں سے کرنے لگ جاتے ہیں۔ مگر اپنے ملک کی ترقی میں ذرا بھی حصہ نہیں لیتے---

یہاں ہیں ایسے لوگ' جو دو چار سالوں بعد پاکستان جاتے ہیں تو واپس آ کر سو سو باتیں بناتے ہیں- میں یہ سمجھتی ہوں جس نے اپنے وطن کو گالی دی- گویا اپنی ماں کو گالی دی-"

"واہ---" زنیر احمد جھوم اٹھا-

کیونکہ جب سے وہ امریکہ آیا تھا- وہ بھی ایک ایک بات سے متاثر ہو رہا تھا- اور اس کا موازنہ اپنے وطن کی ہر بات سے کرتا رہتا تھا-

"آپ کی باتیں سن کر تو ایک دم گھر یاد آ گیا---؟"

"اچھا"...... وہ ہنس پڑی-

"گھر یاد آیا ہے--- یا کوئی اور بھی---؟"

زارا نے یہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا-

زنیر احمد نے اس ادھورے فقرے کو بڑھ کر پکڑا نہیں- اسے کلپنے کے لئے فضا میں چھوڑ دیا اور اس بھری بھری خوب صورت لڑکی کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا- دور سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی ڈوبتی شعاعوں کی سیدھ میں دونوں چلے آ رہے تھے--- یہ ڈوبتی ہوئی زرد سنہری شعاعیں اس گندم کی طرح سنہری لڑکی پر پڑ رہی تھیں--- آمنے سامنے سونا ٹکرا رہا تھا--- سونے میں سے آگ نہیں ٹھنڈک نکلتی ہے--- یہ ٹھنڈک زنیر احمد کے دل میں اتر گئی...... اس کا بے اختیار دل چاہا آگے بڑھ کر اس کی پتلی کمر کے گرد بازو کی زنجیر بنا لے اور بالکل اس طرح چلنا شروع کر دے' جس طرح نوجوان امریکن لڑکے اور لڑکیاں چلتے ہیں-

"آپ کو معلوم ہے' اس ہفتے لونگ ویک اینڈ آ رہا ہے---؟" زارا نے پوچھا-

"ہاں---" زنیر بولا-

"ہم نے پکنک پر جانے کا پروگرام بنایا ہے' آپ چلیں گے-"

''کون کون جا رہا ہے---؟''

''میں اور فیروزہ---اور آپ---اگر جانا چاہیں تو---''

''فیروزہ بھی جائے گی---؟ تو پھر کیا خاک مزہ آئے گا-'' کہنے کو تو زنیر نے یہ کہہ دیا-مگر ایک دم شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا-

زارا معنی خیز انداز میں مسکرائی اور بولی-''فیروزہ کا بوائے فرینڈ عبدالکریم بھی ساتھ جا رہا ہے-''

''ہیں---اس کا فرینڈ ہے-''

''جی ہاں---وہ ایک انڈونیشین مسلمان ہے-یہاں رہتا ہے-''

''تو پھر ٹھیک ہے' میں بھی چلوں گا---!''

زارا واپس آئی تو اس کا دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا---چار مہینوں سے زنیر سے تفصیلی ملاقاتیں ہو رہی تھیں-کچن میں ہڑ بونگ مچتی---لفٹ میں تنہا اوپر نیچے آتے بازار ایک ساتھ جاتے---زارا ہی نے زیادہ تر اسے یہاں کے ٹریفک کے اصول سمجھائے تھے روز ہی اس کے ساتھ کسی نئی جگہ پر جاتی تھی-مگر حیران بھی ہوتی تھی زنیر عام آدمیوں سے کتنا مختلف تھا کبھی کبھی تو وہ اسے بالکل اناڑی دکھائی دیتا-ایسے آدمی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے نا؟

جس پکنک اسپاٹ پر زارا اور فیروزہ اسے لے گئی تھیں-وہ ایک جھیل کے کنارے تھا اور جھیل میں مختلف پرندوں کی شکلوں کے شکارے بھی چل رہے تھے-فیروزہ اور عبدالکریم ہاتھوں میں ہاتھ دے کر یوں ایک طرف نکل گئے-جیسے کوئی اور ان کے ساتھ تھا ہی نہیں-

زارا اور زنیر بھی گھوم پھر کر واپس آ گئے-وہاں اور بھی بے شمار لوگ تھے مگر ہر ایک دھن میں مست تھا-کسی کو کسی دوسرے کو دیکھنے کی فرصت نہ تھی-زارا ایک ناول لے آئی

تھی - اس کا خیال تھا - جب بور ہونے لگیں گے تو وہ ناول پڑھنا شروع کر دے گی -

''وہ ایک ہاتھ پہ سارے جسم کا زور ڈالے - دوسرے ہاتھ سے ناول پکڑے پڑھ رہی تھی کہ ایک دم زنیر ارد گرد کا جائزہ لے کر واپس آ گیا - اور بولا -

''آپ یہاں بھی کتاب لے آئیں ---؟''

زارا نے اپنی وحشی آنکھیں اٹھا کر زنیر کو دیکھا اور بڑی آہستگی سے بولی -

''آپ مجھے 'آپ' کیوں کہتے ہیں - کیا میں آپ سے بڑی لگتی ہوں -''

''نہیں تو ---''

''پھر ---''

''آپ بھی تو آپ ہی کہتی ہیں -''

''چلو آج کے بعد میں تمہیں تم کہہ دیا کروں گی - مجھے تو آپ کہنا ذرا بھی اچھا نہیں لگتا - یہاں امریکہ میں تو والدین کو بھی آپ کہنے کا رواج نہیں ہے -

''بس عادت سی پڑ جاتی ہے -'' زنیر بولا -

''نہیں ہمارے ہاں تکلفات کا بہت رواج ہے اور ایک دم بے تکلف ہونے کو پسند نہیں کیا جاتا ---؟''

''حالانکہ تم مجھ سے ایک دم بے تکلف ہو گئی تھیں اور میں نے اسے پسند کیا تھا -''

''اچھا'' ...... زارا مسکرائی -'' تم نے اس پسندیدگی کا ذکر پہلے تو کبھی نہیں کیا؟''

زنیر نے نظریں جھکا لیں ......

زارا اسے دیکھتی رہی - پھر کتاب پڑھنے لگی - زنیر نے نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا -

''تم نے فیروزہ اور کریم کو دیکھا ہے --- ذرا دیکھو کس طرح بیٹھے ہیں؟''

میں تو انہیں روز ہی دیکھا کرتی ہوں- زارا نے نظر اٹھائے بغیر کہا-

''کیا محبت ایسا ہی جذبہ ہے کہ آدمی اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو جاتا ہے-''

''پتہ نہیں---'' زارا نے ایک دم کتاب سے نظریں ہٹا کر کہا-

''مجھے تو کوئی تجربہ نہیں نیرو-'' زارا آہستہ آہستہ سے بولی-''تم بتاؤ---تم نے کبھی محبت کی ہے-''

زارا کی آواز میں جانے کیا تھا- زنیر سر سے پیر تک لرز گیا- اس کی نظر زارا کے اس ہاتھ پر چلی گئی جو گھاس پر پڑا ہوا تھا---گورا گلابی ہاتھ--- جیسے کہ گلاب کا پورا کھلا ہوا پھول رکھا ہو---

وہ غور سے اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگا اور زارا اس کے چہرے کو دیکھنے لگی- کافی لمحے یونہی بیت گئے---

گھاس پر پڑا گلاب انگارہ بن گیا تو بے اختیار زنیر نے اپنا گرم گرم ہاتھ زارا کے ہاتھ کے اوپر رکھ دیا--- بلکہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں چھپا لیا- ڈھک لیا--- پھر اس نرم و گداز ہاتھ کو تھام کر اس زور سے دبایا کہ زارا کو اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا-

کس قدر خوب صورت انداز تھا- اظہار محبت کا--- زارا نے اپنا ہاتھ چھڑایا نہیں- جانے کب تک وہ ہاتھ زنیر کے ہاتھ میں رہا--- پھر وہ ہاتھ اس کی آنکھوں تک گیا- اس کے ہونٹوں تک گیا---اور ہاتھ اس کے دل تک پہنچ گیا-

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو دونوں کی ہنسی نکل گئی- زنیر کی آنکھیں چل رہی تھیں- سوال کر رہی تھیں--- سلگ رہی تھیں- زارا کی آنکھوں شرما رہی تھیں--- دونوں جذبات کے پل صراط پر پہنچ گئے تھے- زارا جانتی تھی- محبت میں ایک کمزور لمحہ ضرور آتا ہے--- جو سب سے زیادہ مضبوط بن جاتا ہے-

محبت تو الوہی نغمہ ہے۔

''آفاقی زبان ہے---

اس کے معانی تو آسمانوں پر لکھے نظر آتے ہیں۔ چاند ستارے' بادل ہوائیں' سب محبت ہی کے مظہر ہیں۔

محبت تو جنت کا میوہ ہے۔

اسے چکھنے کے بعد تن من کی ساری بھوک مٹ جاتی ہے۔

محبت تو انکسار کا آبشار ہے۔

ایک بار کے رم جھم پانی سے غسل کر لیں تو تن میں انا کے سارے کیڑے مر جاتے ہیں

محبت تو ایک آسمانی آگ ہے۔

ایک خاکی اسے زمین پر لے آیا تھا۔ تب سے بے رحم دھرتی سلگ رہی ہے۔ زارا کے چہرے پر وہ سارے رنگ نکھر آئے۔ جو محبت کے جھرونکوں سے جھانکا کرتے ہیں...... یہ سارے رنگ جوانی کے ہجولی ہیں...... کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ دنیا کے میلے میں کوئی ایسی شبیہ نظر آ جاتی ہے۔ جس کو دیکھ کر تلاش کا چلتا پانی رک جاتا ہے--- جہاں پانی رکتا ہے۔ وہیں ایک گہری جھیل بن جاتی ہے--- ورنہ تو تلاش ناکامی کی صورت میں متعفن ہو جاتی ہے۔

''ہاں تو ہو گئی بات---''

فیروزہ نے رات کو سونے سے پہلے زارا کو چھیڑا ہے۔

زارا صرف مسکرا دی۔

''اچھا یہ تو بتا مجھے--- کہ اس کو دن نے بات کیسے شروع کی۔''

''اسے کو دن کہہ رہی ہے؟''

''اور کیا کہوں--- تیرے سامنے تو اس کے منہ سے بات ہی نہیں نکلتی - پھر اس نے محبت کا اظہار کس زبان میں کیا؟''

''خاموشی کی زبان میں---''

''ہیں---؟ خاموشی کی زبان کیا ہوتی ہے؟ اور اس میں اظہار محبت کیسا ہوتا ہے''

''بس ہو گیا---؟'' زارا نے نرم تکیہ منہ پر رکھ لیا-

فیروزہ نے آگے بڑھ کر وہ تکیہ اس کے منہ سے ہٹا دیا اور بولی-

''آج پوچھے بغیر سونے نہیں دوں گی-''

''جب کوئی بات نہیں ہوئی تو کیا بتاؤں---؟''

زارا اٹھ کر بیٹھ گئی-

''قسم سے--- میں نہیں مانتی''

''نہ مان---''

''اور تجھے تسلی کیسے ہو گئی- جبکہ محبوب کے ایک بار اظہار محبت سے بالکل تسلی نہیں ہوتی- دل چاہتا ہے- وہ جب تک بیٹھا رہے- بار بار اظہار محبت کرتا رہے- ہر روز ملے---تو ہر روز نئے طریقے سے اپنی محبت کا یقین دلائے- بھلا عورت کو کبھی ایک بار اظہار محبت سے تسلی ہوئی ہے؟''

''میں نہیں جانتی---'' زارا چڑ گئی-

''مگر میں تو پوچھ کر رہوں گی-''

''پھر جاؤ اسی سے پوچھ لو-''

''سچ مچ اس نے کچھ بھی نہیں کہا- پھر بھی تم نے سب سمجھ لیا---؟''

زارا ہنسنے لگی-

''واقعی تم لوگ پاگل ہوتے ہو- عجیب- کس قدر عجیب--- مرد محبت کیے جاتے ہیں اور اظہار نہیں کرتے اور لڑکیاں ذرا سے اشارے کنائے کو محبت کی انتہا سمجھ لیتی ہیں-''

زارا پھر ہنسنے لگی-

''کیا بکواس ہے- یا تم لوگ منافق ہو- یا پھر بڑے گہرے ہو-''

''ہم لوگ گہرے ہیں---؟''

''تو اس گھنے آدمی کے ساتھ کیونکر گزارا ہوگا---؟''

''ہو جائے گا---!''

''اچھا تو معاملہ اس قدر آگے بڑھ چکا ہے-''

''تمہارا وہ دیسی بیر کی آنکھوں والا کریم جب تمہارے پاس ہو' نا تو پھر تمہیں دنیا میں کسی اور کا ہوش نہیں ہوتا- سب کچھ تمہارے سامنے ہوتا رہا اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہ چلا''......

''اچھا صبح ہو لینے دو اس گھنے حضرت سے دو دو ہاتھ کروں گی اور پوچھوں گی بھئی چار مہینے کے طویل انتظار کے بعد--- اس قدر بودے طریقے سے اظہار محبت کر گئے ہو- کہ نہ بھونچال آیا--- نہ طوفان--- اور اس کو دیکھو کیسے تن من ہارے بے سدھ لیٹی ہے- اس نے تکیہ اٹھا کر زور سے زارا کے منہ پر دے مارا-

............☆............

''پاپا جی یہ کہتے تھے کہ ایک بار پاکستان چل کر اس لڑکے کے والدین سے ملا جائے- مگر ممی جان کہتی تھیں- سب ٹھیک ہے- میں نے ہر طرح سے تسلی کر لی ہے- اتنا شرمیلا شریف النفس اور منکسر المزاج لڑکا اور کہاں ملے گا- اس میں آج کل کے لڑکوں

والی فوں فاں ہی نہیں ہے- اتنے دن ہو گئے- امریکہ آئے- سگریٹ اور شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا- یہ امریکی لڑکیاں تو اجنبیوں کے گلے پڑتی ہیں- اس کو کسی لڑکی کے ساتھ نہیں دیکھا دفتر سے آ کر اپنے اپارٹمنٹ میں پڑا رہتا ہے---

''جب بھی بلاؤ جی- جی کرتا ہوا آ جاتا ہے---''

پاپا جی کہتے تھے- یہ کوئی مرد کی کوالیفکیشن نہیں ہوتی--- جی...... جی کرنا تو مرد کی مجبوری ہوتی ہے- ویسے بھی کیا ہرج ہے اگر اگلے سال تک اس بات کو روکے رکھیں ان کا ارادہ ۸۱ء کے آخر میں پاکستان جانے کا تھا--- وہاں جا کر وہ باقاعدہ اس کے والدین سے بات کرنا چاہتے تھے-

''مگر ممی جی' لڑکے پر بری طرح ریجھ گئی تھیں- ممی جی اگلے سال حج پر جانا چاہتی تھیں- اس لئے فرض کو جلدی نبھانا چاہتی تھیں---اور زارا کے دل میں بھی ایک چراغ جل اٹھا تھا---

اس نے تو اس اجنبی سے کچھ نہیں پوچھا تھا--- اس نے زرا سی دستک دی- اس نے پٹ سے دل کا دروازہ کھول دیا- اندر چاندنی جیسا دودھیا کورا کاغذ بچھا تھا- جھٹ ستاروں سے اس نے اس کورے کاغذ پر اجنبی کا نام لکھ دیا--- نام چاند بن کر دل کے صحرا میں اتر گیا--- صحرا کی گود میں چاندنی کا جوبن نکھر آتا ہے- ''زارا'' زنیر نے دھیرے سے اس کی کمر کو چھوا تو وہ پرے ہٹ گئی-

''کیا بات ہے-''

اس نے مڑ کر دیکھا تو زنیرہ کا چہرہ تپ رہا تھا- یہ تپش اس کو اچھی لگتی تھی اس میں طلب تھی- والہانہ پن تھا- ایک سوز تھا- جب وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تو اس کا چہرہ گرم توا بن جاتا تھا-

''آؤ میرے کمرے میں کچھ دیر باتیں کریں''

''کمرے میں نہیں آؤں گی۔''

''کیوں---''

''کمرے میں آنے سے مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''مگر اس سے پہلے تم بیسیوں مرتبہ آئی ہو بلکہ میرا کمرہ صاف کیا ہے تم نے۔''

''تب کی بات اور تھی۔''

''مگر اب کیا ہو گیا ہے''

''تم نہیں جانتے کیا ہوا ہے---''؟

اس نے تو اس طرح اپنی وحشی آنکھوں کی سلاخیں۔ زنیر کی آنکھوں میں گاڑیں کہ زنیر چکرا گیا۔ پھر وہ دوڑ کر اپنے اپارٹمنٹ میں چلی گئی۔ فیروزہ سو چکی تھی اور اس کے اپنے بستر پر نوجوانی کے ترو تازہ ارمان بکھرے پڑے تھے---

☆

دوسری رات--- پھر زنیر بالکنی میں آ کھڑا ہوا اور بولا۔

''رات بھر مجھے نیند نہیں آئی---''

''کیوں---؟'' وہ انجان بن کر بولی۔ حالانکہ کروٹیں وہ بھی بدلتی رہی تھی۔

''تم جانتی ہو...... اپنا کمرہ مجھے اس سے پہلے اتنا سرد اور اتنا تنہا کبھی نہ لگا تھا۔ زارا تم آخر میرے کمرے میں کیوں نہیں آتی ہو۔''

زارا جانتی تھی۔ اب وہ اپنی بے چینی کے سوا نیزے پر پہنچ چکا ہے۔ یہ چپ چاپ عاشق' اندر سے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ جذباتی اور جنگلی'

''بولی---'' اس بار ممی آ رہی ہیں۔ پاپا بھی ساتھ ہوں گے۔ بات کر لو نا---''

''ڈر لگتا ہے۔''

''اچھا تو اب تمہیں ڈر لگتا ہے۔ ڈرنے والوں کو محبت نہیں کرنی چاہیے۔''

''جب جب تمہارے جیسی پاگل کر دینے والی لڑکیاں سامنے آتی رہیں گی --- مرد راستہ بھولتے رہیں گے۔''

''اچھا --- اتنے بزدل بن کر نہ دکھاؤ۔ جتنے تم ہو نہیں''......

زنیر ہنسنے لگا۔

''تمہیں معلوم ہے مجھے زبردستی کرنا بھی آتا ہے۔''

''مگر تم جانتے ہو نا؟ میں پاکستانی لڑکی ہوں۔ میرے اندر سے میرا کلچر، رسم ورواج اور پرانی روکایات نہیں نکلیں، لیکن --- میں امریکہ میں رہتی ہوں تو کیا ہوا ---؟ تم مجھے چاہتے ہو تو کیا بڑی بات ہے --- تم مجھے چھو نہیں سکتے --- ہم نے ابھی تک وہی اسٹینڈرڈ مقرر کر رکھے ہیں کہ حد بندی لائن کو شوہر ہی توڑتے ہیں --- میں بڑی بے تکلف اور صاف گو لڑکی ہوں --- مگر --- نیرو --- شادی کے معاملے میں --- ویسے ہی ہوں، جیسی لڑکیاں تمہارے ملک میں ہوتی ہیں۔''

''تو پھر میں اور کتنا صبر کروں۔''

''کرسمس سے پہلے میرا آخری سمیسٹر ہوگا --- اس سے پہلے تو میں شادی بھی نہ ہونے دوں گی۔ ویسے تم ممی سے بات کر لینا۔''

''اف میرے خدایا۔ یعنی دو مہینے اور صبر کرنا ہوگا۔''

''جی ہاں''......

یہ کہہ کر زارا اپنے اپارٹمنٹ میں چلی گئی۔

............☆............

نئے سال کی برف کپاس کے پھولوں کی طرح فضا میں دھیرے دھیرے گر رہی تھی- باہر فضا خواب آلود ہو رہی تھی- اور اندر زارا کی سہیلیاں ڈھولک بجا رہی تھیں- زارا چاہتی تھی کہ اس کی شادی بالکل پاکستانی طریقے سے ہو- مہندی کی رسم کی جائے- ساری رات ڈھولک بجائی جائے- اور لوک ناچ کئے جائیں- شادی کے لئے اس نے سرخ غرارہ سوٹ پاکستان سے منگوایا تھا- جبکہ زنیر ان باتوں کے حق میں نہیں تھا- وہ کہتا تھا- کمال ہے آپ لوگ امریکہ میں رہ کے اتنے قدامت پسند ہیں- اب تو پاکستان میں لڑکیاں سرخ کپڑے پہننا پسند نہیں کرتیں-

''جی نہیں---'' زارا کی ضد تھی- کہ صدیوں سے ہمارے ہاں دلہن کا تصور سرخ کپڑوں سے وابستہ ہے- گلاب کا پھول لگتی ہے- دلہن اور سرخ رنگ کیسا سہاگن سا رنگ ہے-

''دیکھو نا یورپ اور امریکہ میں دلہنیں سفید لباس پہنتی ہیں- مگر کیوں؟'' اس کی ایک نفسیاتی وجہ ہے- زارا کہتی-

''تم بھی سفید لباس پہنو-'' زنیر کہتا- ''تم ایک روایت شکن لڑکی ہو- نئی راہ متعین کرو-''

''کمال ہے-'' زارا کہتی- ''زنیر تم ویسے کتنے لئے دیئے رہتے ہو- تمہارے اپنے کلچر کی چھاپ تم پر گہری ہے- مگر اندر سے کتنے باغی ہو- فیروزہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے کہ تم ''گھنے آدمی'' ہو-

اس پر زنیر بے اختیار ہنس دیتا-

اس کو بس شادی کی جلدی تھی- وہ رسموں اور رواجوں میں الجھ کر معاملہ التوا میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا- اس کی بیتابی زارا کو بہت پسند تھی- وہ سوچتی محبت کے بارے میں

زنیر نے ابھی ایک لفظ بھی نہیں کہا- جانے کیسے کیسے تیر اپنے ترکش میں سنبھال کے رکھے ہوں گے--- بند جھرنے کا منہ کھول دو تو پانی کیسی وارفتگی اور جنونی کیفیت میں جھر جھر نکلنے لگتا ہے- اسے ایسا جنون پسند تھا-

وہ شادی سے پہلے کے جمع خرچ کی قائل نہ تھی- خود اس نے بھی تو اظہار نہ کیا تھا دونوں طرف گھٹائیں بھری کھڑی تھیں- انہیں بس ہوا کا اشارہ ملنے کی دیر تھی-

دھواں دھار اور چھاجوں مینہ برسنے کی امید تھی-

زارا نے اپنی ضد منائی' سرخ کپڑے پہنے بلکہ اس کے ساتھ ہی فیروزہ نے بھی سرخ پاکستانی غرارہ پہنا- شادی دھوم دھام سے ہوئی- سارے پاکستانی جو آس پاس رہتے تھے شریک ہوئے- بارات واشنگٹن ڈی سی میں گئی تھی- ممی اور پاپا کے گھر--- اور وہاں سے رخصت ہو کر سب میری لینڈ زنیر کے اپارٹمنٹ میں آ گئے تھے-

دوسری صبح..... جب زارا صبح صبح اپنی چوڑیاں اور انگوٹھیاں پہن رہی تھی تو آئینے کے آگے کھڑے ہو کر سوچ رہی تھی-

نیرو کیسا خوب صورت آدمی ہے- کتنا مکمل--- اور تجربہ کار--- یہ تو ذرا بھی اناڑی نہیں لگتا- شکل سے جتنا معصوم اور بدھو نظر آتا ہے- حقیقت میں بالکل ویسا نہیں ہے..... اور دوسرے آئینے کے آگے شیو کرتا ہوا زنیر سوچ رہا تھا-

کتنی پیاری ہے یہ لڑکی-

کہنے کو امریکہ میں رہتی ہے--- مگر کتنی پاکباز اور شرمیلی--- ان چھوئی- کچی کلی' ادھوری مگر معطر معطر--- بالکل ہماری روایتی لڑکیوں کی طرح---

یوں لگتا ہے- نئی تہذیب کا گرم جھونکا تو اسے چھو کر بھی نہیں گیا-

کوری صراحی کی مانند---

جس میں پہلے پہل پانی ڈالیں تو مدھر آوازوں کے ساتھ سمٹتی جاتی ہے۔

بظاہر کتنی تیز اور طرار ہے۔

یہ لڑکیاں بھی ہاتھی کے دانت ہوتی ہیں۔

کبھی کچھ۔۔۔کبھی کچھ۔۔۔

اپنے آپ کو ہر ماحول اور ہر جگہ میں غلافوں میں لپیٹ کر رکھتی ہیں۔کیسی سندرسی ہے یہ۔۔۔کہ اس کا نشہ اترتا ہی نہیں۔

دوسرے دن زنیر نے ہوٹل میں دعوت ولیمہ دے رکھی تھی۔ وہیں پر زارا نے زنیر کے بہت سے دوستوں سے ملاقات بھی کی۔ اور تیسرے دن وہ کینیڈا کے لئے روانہ ہو گئے۔

انہوں نے سن رکھا تھا کہ اکثر نو بیاہتا جوڑے اپنی شب عروسی منانے کے لئے سیدھے نیاگرہ فال چلے جاتے ہیں۔

کیوں؟

وہاں پہنچ کر نیاگرہ فال کے تیز وتند دھاروں کی بوچھاڑ میں کھڑے ہو کر زارا۔۔۔کو آپ ہی آپ پتہ چل گیا۔

شاید اس لئے کہ شادی کی پہلی رات۔ دونوں طرف یہی تندی اور تیزی ہوتی ہے۔ بعض اوقات جذبات کا ٹکراؤ کائنات کا ٹکراؤ بن جاتا ہے۔

..........☆..........

ٹھک ٹھک......دروازے پر دستک ہوئی تو زارا اپنے بستر میں کسمسائی۔

زنیر بولا۔ '' مجھے تمہاری یہ سہیلی زہر لگتی ہے...... وقت بے وقت آ جاتی ہے تنگ کرنے۔''

''ہائے بیچاری صبح ہی صبح ہمیں بیڈ ٹی دینے آئی ہے۔''

''یہ وقت ہے جگانے کا۔''

''دیکھو تو دن کے نو بج رہے ہیں۔''

''جو بھی ہو...... اسے منع کر دو۔ یہ ہمارے کمرے میں نہ آیا کرے۔''

''شادی سے پہلے تمہیں بہت اچھی لگتی تھی۔ ہمیں تنہائی میں بیٹھنے کے مواقع جو دیا کرتی تھی۔''

''تب کی اور بات تھی۔ اس وقت وہ ہماری مجبوری تھی۔''

''اور اب ہم اپنے آپ میں مست ہو کر اسے بھول جائیں۔''

''ویسے بھی --- جب بھی اس کو دیکھو --- اعصاب پر سوار نظر آتی ہے۔ مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

ٹھک ٹھک...... دوبارہ دستک ہوئی تو زارا بستر سے نکل آئی۔ اس نے اپنا ڈریسنگ گاؤن پہنا اور دروازہ کھول دیا۔

''گڈ مارننگ''

''گڈ مارننگ'' --- فیروزہ نے بھی خوشدلی سے کہا اور چائے کا ٹرے اسے تھما دیا

''شکریہ بہت بہت روزی'' --- زارا نے پیار سے کہا۔ ''تم بڑی پیاری ہو۔''

فیروزہ بھاگ گئی ---

''ٹھہرو روزی بات تو سنو ---''

''نہیں'' اس نے مڑ کر کہا۔ ''میں صرف چائے دینے آئی تھی۔ آپ لوگوں کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی۔ پھر میں نیچے جاؤں گی۔ کپڑے دھونے کا ڈٹرجنٹ ختم ہو چکا ہے۔ آج مجھے لانڈری کرنا ہے۔ تم جب تیار ہو جاؤ تو اپنے اور زنیر کے کپڑے یہاں

دروازے کے باہر رکھ جانا- میں دھوں دوں گی-"

"ٹھیک یوروزی ڈارلنگ---"

زارا نے اندر جا کر دروازہ بولٹ کر دیا-

"ہیرا ہے ہیرا میری سہیلی---" زارا نے ٹرے میز پر رکھ دیا اور ایک پیالی زنیر کی طرف بڑھائی-

"پتہ ہے وہ کیا کہہ رہی تھی-"

"شکر ہے اللہ کار کی نہیں---" زنیر نے چائے کا گھونٹ بھر کے کہا- "ورنہ آج تو میں اس سے الجھ پڑتا-" زارا کرسی پر بیٹھ کر چائے سپ کرنے لگی- پھر خالی پیالی باورچی خانے میں رکھ کر اس کے پاس آ گئی- بستر پر بیٹھ کر کہا---

"نیرو! تم بڑے حاسد ہو- یہ تو مجھے شادی کے بعد اندازہ ہوا-"

"ہاں میں حاسد ہوں' ہوا بھی تم سے چھو کر گزر جائے تو میں تم سے حسد کرنے لگتا ہوں-"

"تمہارا کیا بنے گا---؟"

"کیوں---؟"

"تم تو اپنے بچوں سے بھی حسد کرو گے-"

"اسی لئے تو میں بچہ پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہوں-"

"مگر مجھے تو بچے بہت پسند ہیں-" زارا نے ڈوب کر کہا-

"ہاں اچھے ہوتے ہیں بچے---مگر ابھی نہیں-"

"ابھی کیوں نہیں---؟"

"ابھی تو میں نے---جی بھر کے تمہیں---" ...... پھر وہ رک گیا-

''خود غرض نہ بنو نیرو۔ تم مجھے کوئی جاب بھی نہیں کرنے دیتے۔۔۔ آگے پڑھنے بھی نہیں دیتے اور بچہ پیدا کرنے کے حق میں بھی نہیں ہو۔ پھر میں کیا کروں گی۔ دیکھو تو تین مہینے میں ہی میرے اوپر چربی چڑھ گئی ہے۔ مجھے گھر بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔''

''میں نے صرف محبت کرنے کے لئے تم سے شادی کی ہے۔۔۔'' اور بس۔

''تم صبح کو دفتر چلے جاتے ہو۔۔۔ تھوڑا سا کام کر کے میں اونگھتی رہتی ہوں۔''

''بس میرا انتظار کیا کرو۔''

''نیرو۔۔۔'' زارا نے مچل کر کہا۔ ''یہ تو بہت زیادتی ہے۔''

''بس میں زندگی بھر ایسی ہی زیادتیاں کرتا رہوں گا۔''

''جب ہم پاکستان چلے جائیں گے نا۔۔۔ تو پھر جتنی مرضی زیادتی کر لینا۔ یہاں مجھے کام کرنے کی اجازت دو۔''

''بس یہاں تو ایک ہی اجازت مل سکتی ہے۔''

اس کی آنکھوں میں شرارت دیکھ کر۔۔۔ زارا ہنسی تو وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

............☆............

''زارا۔۔۔ خدا کی قسم مجھے اب تم پر رشک آنے لگا۔ ہے۔۔۔'' فیروزہ نے واقعی رشک میں ڈوب کر کہا۔

''کیوں۔۔۔؟''

''تمہارے ملک میں شوہر اس طرح محبت کرتے ہیں؟''

''زارا ہنسنے لگی۔

''بالکل کہانیوں والی محبت لگتی ہے۔ دیکھو نا۔ زنیر کی نگاہ تمہارے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں۔ ہر وقت تمہیں ساتھ لئے پھرتا ہے۔ ایک منٹ کے لئے کہیں نہیں جانے دیتا۔ تنہا

نہیں چھوڑتا اور کہنے کو تمہاری شادی کو چھ ماہ ہو گئے ہیں۔''
''ارے چھ ماہ ہی تو گزرے ہیں۔صدیاں تو نہیں گزر گئیں''۔زارا بولی۔
''چھ ماہ بھی بہت زیادہ عرصہ ہے۔ زارا۔ اکتانے والے تو ایک ماہ میں ہی اوب جاتے ہیں۔تم مرد کی فطرت کو نہیں جانتیں۔''
زارا نے اپنا اپارٹمنٹ چھوڑا نہیں تھا۔ ویسے وہ دن رات زنیر کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔مگر اس کے پرانے کپڑے اور پہلی چیزیں ابھی تک اپنے پرانے پارٹمنٹ میں پڑی تھیں۔ ویسے بھی وہ اس سال کا کرایہ اڈوانس دے چکی تھی۔ پھر اسے یہ بھی خیال آتا تھا اگر اس نے ایکدم اپارٹمنٹ سے اپنے آپ کو بیدخل کر دیا تو سارا بوجھ بے چاری فیروزہ پر آ رہے گا۔ وہ چاہتی تھی پاکستان جانے تک وہ فیروزہ ہی کی پارٹنر ہے۔ پھر فیروزہ ان کی خدمت بھی کرتی تھی۔ چائے بنا دیتی تھی۔ کپڑے دھو دیتی تھی---اگر وہ گھومنے گھامنے چل دیتے---تو ان کا کمرہ بھی صاف کر دیتی تھی۔
زارا کو تو صرف صبح کے وقت ہی فرصت ہوتی تھی جب زنیر دفتر جاتا تھا۔ پھر وہ آتے ہی اسے کہیں جانے نہیں دیتا تھا۔
''میں نے تم سے کہا تھا نا روزی---کہ ہمارے ملک کے آدمی بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں وہ شرمیلے نظر آتے ہیں۔مگر ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔''
''ہاں اب میری سمجھ میں آ گیا۔ ہے۔ ہر عورت چاہتی ہے۔اس سے ٹوٹ کر محبت کی جائے۔کاش! میں نے بھی کوئی پاکستانی لڑکا پسند کیا ہوتا!''
''اب بھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''زارا نے شرارت سے کہا۔
''کمینی---''فیروزہ دھاڑی---''تجھے معلوم ہے نا! میں عنقریب عبدالکریم سے شادی کر کے اس کے ملک جا رہی ہوں۔''

''یہ تو میں پچھلے دو سالوں سے سن رہی ہوں۔''

''تو دو سال اور بھی یہی کہتی رہوں گی۔'' یہ کہہ کر فیروزہ ہنسنے لگی۔

''اچھا اگر تیرا ارادہ بدل جائے نا! یا اس عناب کی آنکھوں والے سے دل بھر جائے نا! تو مجھے پاکستان میں خط لکھ دینا۔ وہاں تیرا بندوبست کر دوں گی۔''

''اچھا یہ تو بتا۔۔۔تو پاکستان کب جا رہی ہے۔؟

''بس چھ مہینے رہ گئے ہیں۔ نیرو کی ٹریننگ پوری ہو جائے گی اور میں چلی جاؤں گی۔''

''تیرا امریکہ چھوڑنے کو کیسے جی چاہے گا؟''

''بھئی میں تو پاکستان میں رہنے کو مری جا رہی ہوں۔ یہ مشقت بھری زندگی مجھے پسند نہیں۔''

''مگر وہاں جا کر تو کیا کرے گی۔؟''

''عیش کروں گی۔ بچے پیدا کروں گی۔۔۔! کھا کھا کے موٹی ہو جاؤں گی۔''

''ہائے یہ آئیڈیالسٹک لڑکیاں۔۔۔ بالآخر موٹی موٹی بھری بھری عورتوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ قیمتی کپڑے پہن کر مسکراتی ہیں اور ہیرے کی انگوٹھیاں انگلیوں میں پہن کر دکھاتی ہیں۔

''یہ بھی زندگی کا ایک چلن ہے روزا۔۔۔اور مجھے بے حد پسند ہے۔ وہاں ہمارے ملک میں گپ شپ لگانے کو وقت ہوتا ہے۔ کسی کے دکھ سکھ سننے کا وقت ہوتا ہے۔ وہاں لوگ زندگی بڑے نیچرل انداز میں گزارتے ہیں۔''

''زنیر نے زارا کو بتایا تھا کہ وہ لوگ اپریل کے آخر میں پاکستان جائیں گے۔ تب سے زارا تھوڑی تھوڑی کر کے کئی چیزیں اکٹھی کر رہی تھی اپنے سسرالی رشتہ داروں کے

لئے گو زنیر نے اسے تحائف خریدنے سے منع کر دیا تھا۔ مگر وہ تو رشتوں کی نزاکت کو سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی۔ جب کوئی امریکہ یا یورپ سے جاتا ہے تو سب عزیز و اقارب خواہ مخواہ کسی تحفے کی آس رکھتے ہیں۔ نہ لے جاؤ تو سو سو باتیں بناتے ہیں۔ ممی جی اور پاپا جی نے اسے ایک چیک دے دیا تھا تاکہ وہ پاکستان جاتے ہی اپنے لئے وہ تمام ضروری لوازمات خرید لے۔ جو شادی شدہ زندگی کا خاصا ہوتے ہیں۔ مگر وہ انہی میں سے پیسے نکال نکال کر تحفے جمع کر رہی تھی۔ اور زنیر سے چھپا کر اپنے اپارٹمنٹ میں رکھ لیا کرتی تھی۔

وہ بڑے شاندار طریقے پر پاکستان جانا چاہتی تھی۔ اپنے سسرال والوں کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ کسی بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ کسی گرے پڑے خاندان کی نہیں --- جو فاقے کرتا امریکہ پہنچ جاتا ہے --- اور پھر کچھ بن جاتا ہے ---

کبھی کبھی وہ زنیر سے پوچھتی ---

''نیر و تم نے میرے بارے میں اپنی ممی کو تفصیل سے لکھ دیا ہے نا؟''

''وہ کہتا۔'' ہاں ہاں لکھ دیا ہے ---''

''کیا کہتی ہیں وہ ---''

وہ کہتی ہیں۔'' جیسی تمہاری مرضی''۔

''وہ مجھ سے مل کر خوش ہوں گی۔''

''ضرور ہوں گی --- ہاں ایک بات میں نے نہیں لکھی۔''

''کیا ---؟'' زارا کا دل دھڑک اٹھتا۔

''میں نے صرف یہ لکھا ہے کہ میں نے ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ یہ نہیں لکھا کہ وہ لڑکی مسلمان ہے اور پاکستانی ہے۔

''اس میں کیا مصلحت تھی---؟

''بھئی جب وہ تمہیں ملیں گی نا؟ تو جو رنجش ان کے دل میں ہوگی- وہ بھی یہ جان کر ایک دم دور ہو جائے گی کہ تم ہم مذہب اور ہم وطن ہو-''

''واہ---تم تو بڑے چالاک ہو- یہ گر کہاں سے آئے تمہیں---''

''گر تو مجھے بہت سے آتے ہیں- اور مسلسل تم پر آزما رہا ہوں- اب تمہیں پتہ نہیں چلے تو میں کیا کروں---؟''

''نیرو---مگر یہ بھی تو سوچو--- اگر وہ لوگ کسی گوری چٹی میم کے منتظر ہوئے تو---؟''

''تو کیا تم کسی گوری چٹی میم سے کم ہو- ذرا اپنی رنگت دیکھو--- ہاں اگر بالوں کو سنہری کروا لو تو--- ویسے نہ کراؤ تو اچھا ہے- اتنے گورے رنگ پر سیاہ کالی آنکھیں- اور رات کی طرح گھنگھور بال--- اچھے خاصے آدمی کا ایمان متزلزل کر دیتے ہیں-''

''تم اچھے خاصے آدمی ہو-

''جی ہاں ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا اپنی زندگی کے ساتھ کوئی خواہش نہ تھی مگر---'' پھر وہ چپ ہو گیا-

''کیوں کوئی خواہش نہ تھی- یہ جوان آدمی کا دل خواہشوں کا میدان حشر ہوتا ہے- اور ہر دم وہاں قیامت آتی رہتی ہے-''

''نہیں وہاں قیامت تمہاری صورت میں آتی ہے-''

زارا ہنسنے لگی-

''خدا کی قسم شادی سے پہلے میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ تم ایسی لچھے دار باتیں بھی کر سکتے ہو-''

''شادی سے پہلے میں نے تمہیں کسی بات کا پتہ نہیں لگنے دیا- ورنہ تم کہاں پھنستیں میرے جال میں-''

''اچھا تو جال بچھایا تھا تم نے---''

''بھئی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر جال بچھانے کو دل کرتا ہی ہے نا؟''

''ٹھہرو شکاری کے بچے میں تمہیں مزہ چکھاتی ہوں-''

اس نے تکیئے اٹھا اٹھا کر زنیر پر پھینکنے شروع کر دیئے- مگر زنیر نے دوسرے تکیئے پر ہی اس کو دبوچ لیا-

جن دنوں زارا چپکے چپکے پاکستان جانے کی تیاریاں کر رہی تھی-

انہی دنوں اچانک ممی کو ایک درد اٹھا اور ہسپتال جانا پڑا- وہاں جا کر معلوم ہوا اپنڈیکس ہے- اور فوراً اپریشن ہو گا-

اس وقت زارا کے سوا کوئی نہ تھا جو دن کے وقت ممی کے ساتھ ہسپتال میں رہتا اور ممی کی خبر گیری کرتا- پاپا بھی ان دنوں لاس اینجلس کاروبار کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے-

جب زارا دونوں ہاتھ پھیلائے ممی کی زندگی کے لئے دعائیں مانگ رہی تھی تو زنیر منہ لٹکائے ہسپتال جا پہنچا-

''کیا بات ہے نیرو---؟''

''کچھ نہیں-''

''کچھ بتاؤ بھی پلیز---''

''تم پہلے ہی پریشان ہو-''

''تو کیا ہے--- مجھ سے تمہیں پریشان نہیں دیکھا جاتا-''

''ابھی .....ابھی پاکستان سے کال آئی ہے---''

''کیا---؟''

''میرے ڈیڈی---''

''اوہ کیا ہوا تمہارے ڈیڈی کو---''

''میرے ڈیڈی کو--- زنیر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے--- ڈیڈی کو ایک دن میں دو ہارٹ اٹیک ہوئے ہیں- ہسپتال میں ان کی حالت نازک ہے- ممی نے فوراً بلایا ہے-''

''تو جاؤ..... چلے جاؤ نا!''

''تمہارے بنا کیسے جاؤں''

''دیکھو زنیر میں کیسے جا سکتی ہوں- اس وقت ممی کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں-''

''اور میں تمہارے بغیر کیسے جا سکتا ہوں- میں تو تنہا جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا-''

''نیرو..... نیرو..... ذرا وقت کی نزاکت کا خیال کرو- ہم دونوں تو خوشی خوشی پاکستان جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے- کسے معلوم تھا- ممی کا آپریشن راہ میں آپڑے گا- یا تمہارے ڈیڈی کو اٹیک ہو جائے گا- غیب کی باتوں کا کسی کو علم نہیں ہوتا- مگر اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں''......

زنیر نے اداس ہو کر گردن جھکا لی- تو زارا بولی-

''نیرو- تمہیں میری قسم اس طرح منہ نہ لٹکاؤ..... دیکھو جلدی فیصلہ کرو- ورنہ تمہاری ممی کہیں گی- میں اتنی بیدرد تھی کہ میں نے آنے نہ دیا تھا-''

''جاؤ جا کر اپنی بکنگ کراؤ---''

''مگر ہماری بکنگ تو اگلے مہینے کے لئے ہو چکی ہے۔''

''ان سے کہو ایمرجنسی ہے۔ وہ تمہاری تاریخ فوراً بدل دیں گے۔ میں بعد میں اسی تاریخ پر آ جاؤں گی۔''

''مگر میرا دل نہیں مانتا۔''

''نیرو پلیز جاؤ نا! جلدی جاؤ۔ فون کر کے اپنی سیٹ لو۔ اور کل ہی روانہ ہو جاؤ۔ جو سامان لے جا سکتے ہو لے جاؤ۔ باقی میں لے آؤں گی' فکر نہ کرو۔''

''مگر ممی کیا کہیں گی۔۔۔؟ میں ان سے ملے بغیر چلا گیا۔''

''بھئی ممی کو میں سنبھال لوں گی۔ ساری سچوایشن بتا دوں گی۔''

''اچھا زارا۔۔۔ ایک وعدہ کرو کہ جونہی ممی ٹھیک ہوں گی۔ تم فوراً چلی آ ؤ گی۔''

''بھئی وعدہ کرتی ہوں۔ اسی تاریخ پر آنے کی کوشش کروں گی۔ جو تم نے میرے ٹکٹ پر درج کرائی ہے''......

''اچھا''......

''ہاں ہاں...... جاؤ اور مجھے فون پر اپنا پروگرام بتا دینا۔''

زنیر اسے فون پر صرف اتنا بتا سکا کہ اسے کل شام کی سیٹ مل گئی ہے اور وہ ابھی ائر امریکہ سے نیویارک جا رہا ہے۔ اتنا کم وقت ہے کہ ملنے کے لئے نہیں آ سکتا۔

''زارا نے اسے بڑی خوش دلی سے خدا حافظ کہا۔۔۔ بہت سی دعائیں اس کے ڈیڈی کے لئے بھجیں۔۔۔ اور دھڑکتے ہوئے اداس دل کے ساتھ فون بند کر دیا۔

پندرہ دن کے بعد جب زارا اپنے اپارٹمنٹ میں آئی تو اس کا دل بے حد بوجھل تھا۔ دروازہ کھولا تو اداسیوں کے ناگ پھن اٹھائے ڈسنے کو بڑھے۔۔۔ اسی کمرے میں سہاگ کی شوخ و چنچل بے شمار راتیں بسر ہوئی تھیں۔ اور یہیں اس نے محبت کے سارے

مرحلے طے کئے تھے- اسے زنیر کا والہانہ پن بے اختیار یاد آنے لگا......اس کی باتیں---اس کی چاہت---کتنی دیر تو وہ ساکت کھڑی رہی--- پھر آگے بڑھ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئی---بیٹھے بیٹھے کافی دیر گزر گئی تو اٹھ کر کمرہ صاف کرنا شروع کیا- بہرحال کچھ وقت تو یہاں گزارنا ہی تھا اور ایسے میں فیروزہ بھی پاس پڑوس میں نہیں تھی- آجکل عبدالکریم کے ساتھ سوئٹزرلینڈ چھٹیاں گزارنے گئی ہوئی تھی......

زارا نے الماری کھولی تو دنگ رہ گئی- وہاں زنیر کا کوئی کپڑا نہیں لٹک رہا تھا- یہ الماری زنیر کے کپڑوں سے بھری ہوئی تھی اور جلدی میں ان سب کو لے جانا خاصا مشکل تھا- پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا---تو اسے پتہ چلا---زنیر تقریباً اپنا سب سامان لے گیا تھا- بس دو چار میلے کپڑے اور جوتے رہ گئے تھے-حتیٰ کہ جو تحائف گاہے بہ گاہے زارا خرید کر اس سوٹ کیس میں چھپاتی رہی تھی وہ سوٹ کیس سمیٹ لے گیا تھا''---

اچھا---'' زارا نے سوچا---ممکن ہے- اس نے سوچا ہو کہ میں اکیلی اتنا لمبا سفر کروں گی- اس لئے وہ سب سامان پہلے لے گیا- اسے معلوم تو ہے کہ جاتے وقت مجھے اور بھی شاپنگ کرنا تھی- بے یارا میری تنہائی کے خیال سے زیادہ سے زیادہ سامان لے گیا ہوگا---مگر---یہ سارا سامان ایک دن میں تو پیک ہو نہیں سکتا- جاتے ہوئے زارا نے زنیر سے کہا تھا-

''جان! جاتے ہی مجھے فون ضرور کرنا- اور ڈیڈی کے بارے میں سب بتلانا-'' اور اس نے وعدہ بھی کر لیا تھا-

مگر فون ابھی تک نہیں آیا تھا- ہو سکتا ہے- اس کے ڈیڈی فوت ہو گئے ہوں اور غریب کو فرصت نہ ملی ہو- لیکن اگر وہ خط لکھتا تو پندرہ دنوں میں ضرور مل سکتا تھا-

ممکن ہے آج کل میں اس کا فون آئے تو وہ ساری باتیں تفصیل کے ساتھ اس کو بتا

دے گی- اسے کیا معلوم کونسا تحفہ کس کو دینا ہے؟ اگر سنبھال کر رکھ لے تو زیادہ اچھا ہے-

زارا کے سر میں درد ہونے لگا- تو اس نے اٹھ کر چولہا جلایا اور ایک پیالی کافی کی بنائی...... ساتھ میں دو تین بسکٹ پکڑے--- اور آ کر بستر میں بیٹھ گئی- کمبل ٹانگوں پر ڈال کر پچھلی باتیں یاد کرنے لگی--- زنیر کا آنا--- اس کے ساتھ یادگار صحبتیں--- اور پھر شادی کے مناظر--- ایک سال میں کتنی تبدیلیاں آ گئی تھی- زندگی میں--- اس کا دل ڈوبنے سا لگا--- کافی پی کر اس نے پیالی تپائی پر رکھ دی--- اور تکیہ سرکا کر سونے لگی- اس کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی- جب اس کا دل اداس ہوتا تو وہ سو جایا کرتی تھی-

جونہی اس نے تکیہ اٹھا کر اسے دوبارہ رکھنا چاہا- اس کے نیچے ایک بڑا لفافہ نظر آیا- بیتابی سے اٹھا کر دیکھا تو اس پر لکھا تھا-

''زارا''

اوہ--- زارا نے وہ لفافہ سینے سے لگا لیا- شاید جاتے جاتے زنیر ایک محبت بھرا خط لکھ کر اس کے تکیے کے نیچے رکھ گیا تھا- تا کہ وہ اداسیوں کے ٹھنڈے اندھیروں میں اترنے سے بچ جائے---

لفافہ کافی وزنی تھا-

وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی- ذرا خط پڑھ کر مزہ لینا چاہتی تھی- لفافہ چاک کیا تو ایک چھوٹا سا پرزہ پہلے باہر آ گیا---

''زارا---''

''لفظ معافی بہت چھوٹا اور لایعنی سا ہے' اس لئے میں تم سے معافی مانگتے ہوئے شرما رہا ہوں- مگر بالآخر اسی لفظ معافی کا ہی مجھے سہارا لینا پڑے گا- شروع سے بتاتا ہوں

جب میں امریکہ آ رہا تھا تو دوستوں نے مجھے غلط قسم کی ہدایات دی تھیں- میں بھی یہی سمجھنے لگ گیا کہ امریکہ میں لوگ صرف عیاشی کرنے کے لئے جاتے ہیں-

سوئے اتفاق مجھے تم مل گئیں- خدا کی قسم تمہیں پھنسانے کا میرا پہلے پہل ارادہ نہ تھا مگر جب تم اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ میرے قریب آتی چلی گئیں- تو مجھے اس کھیل میں مزہ آنے لگا- میں شاید یہ کھیل رچا کر چھوڑ دیتا- مگر تم تو بالکل مشرقی لڑکی ثابت ہوئیں- شادی کے بغیر تم نے میرے قریب آنے سے انکار کر دیا- تم مرد کی فطرت کو نہیں جانتی ہو- اپنے نفس کے آگے وہ کسی کی زندگی کی پرواہ نہیں کرتا- امریکہ میں تمہارے جیسی لڑکی کا مل جانا- ایک اتنا خوبصورت حادثہ تھا کہ میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا- اس لئے شادی پر آمادہ ہو گیا- مگر میں نے دانستہ تمہیں بچے کے جھنجھٹ میں نہیں ڈالا- تم میرا یہ احسان مانو گی- جتنا اچھا اور خوبصورت وقت میں نے تمہارے ساتھ گزارا ہے- شاید کسی امریکی لڑکی کے ساتھ نہ گزار سکتا- مگر افسوس تم نے مجھ پر بے اندازہ بھروسہ کر کے ٹھوکر کھائی- میں تمہیں نہ بتا سکا کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں- میرے چار بچے ہیں- تین لڑکیاں ہیں اور ایک لڑکا جو میرے جانے کے بعد پیدا ہوا تھا-

میرے والدین نے جاتے وقت مجھ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا- اگر میں نے وہاں شادی کر لی تو وہ مجھے عاق کر دیں گے-

میں نے یہاں پر اپنی شادی کی اطلاع کسی کو نہیں دی تھی اور خوش قسمتی سے یہ خبر یہاں پہنچی بھی نہیں- میں کئی دنوں سے تم سے جان چھڑانے کی فکر میں تھا- تمہاری ممی نے بیمار ہو کر یہ موقع فراہم کر دیا-

میرے ڈیڈی کو ہارٹ اٹیک بالکل نہیں ہوا- میں مواقع سے فائدہ اٹھا کر جا رہا ہوں- اور دیکھو میری اس کمینگی کو معاف کر دینا- میں اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا

کیونکہ میری تین لڑکیاں ہیں اور ان کی زندگی برباد ہو جائے گی۔

تم امریکہ میں رہتی ہو۔ ان ملکوں میں طلاق کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تو لڑکیاں تفریحاً یا مزید تجربوں کی خاطر شوہر بدل لیتی ہیں۔تم بھی اس شادی کو ایک حسین تجربہ سمجھ کر بھول جانا۔ اس لفافہ میں طلاق نامہ بھی بند ہے اور مہر کے نام پر ایک چیک بھی۔ اور ہاں آئندہ کسی پردیسی پر اتنی جلدی اعتماد نہ کرنا۔

گنہ گار

زنیر احمد صدیقی

زارا نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور قطار اندر قطار نیر اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

تو میرے--- ہم وطن۔ میرے ہم مذہب زنیر احمد صدیقی تو نے مجھے عرش سے فرش پر پھینکا۔

مجھے داغ تمنا دیا--- میری کوری زندگی پر سیاہی پھینکی۔

آرزوؤں کے لق ودق میدان میں آبلہ پا چھوڑ دیا۔

اس لئے کہ تمہاری تین بیٹیاں ہیں اور تمہیں ان کے مستقبل کی فکر ہے۔ اس لئے تم نے کسی کی بیٹی کی زندگی برباد کر دی---

اس لئے کہ پھولوں بھری ایک روش پر--- تمہیں چند قدم کا ساتھ چاہئے تھا۔

تو زنیر احمد صدیقی!

اس امریکہ میں ایسی لڑکیاں مل جاتی ہیں۔ جو ایک رات' ایک ہفتہ' ایک مہینہ یا ایک سال کا سودا کر لیتی ہیں۔

یہاں اس شادی کے بغیر رہنا ایک فیشن بن گیا ہے۔

یہاں آدم وحوا کے کسی بھی روپ کو کوئی نہیں پہچانتا۔

میں تو مانگ میں---سہاگ کی افشاں---جنم سے مرن تک سجانا چاہتی تھی-
صدیوں کی پاگل ہوں میں---قرنوں تک دیوانی رہوں گی!

ساری تاریخ' میری دیوانگیوں سے بھری ہوئی ہے-کب سے منتظر تھی---راہ دیکھ رہی تھی---دل میرا کوہ نور ہیرا تھا---تالوں میں چھپا کے رکھا تھا---زنجیروں کے اندر---قیمتی چیزیں چوری کیوں ہو جاتی ہیں---گزرے دنوں کی تھکن جاتی کیوں نہیں---غم ناپسندیدہ مہمان بن کر دل میں کیوں ٹھہر جاتا ہے؟ پہلی بھول پھانس کیوں بن جاتی ہے-ساری دنیا مجھے سمجھاتی ہے--- میں اپنی بیوقوفیوں پر کافی روچکی ہوں-میری پرورش امریکہ میں ہوتی ہے---مجھے ہر غم بیچ دینا چاہئے تھا-

مگر.......مگر.......یہ میری مٹی.......میری خاک بھی میرے اندر سے نکلے نا!-

جی بہت اداس ہے-

جی کا کیا ہے یہ تو وہ ننھا بچہ ہے-جو کھلونا توڑ کر مچلتا ہی رہتا ہے-دل کے آس پاس درد بھی رہتا ہے--- یہ درد تو چاند کا ہالہ ہے--- ہالے کے بغیر تم نے کوئی چاند دیکھا ہے؟-

ایک بار تم نے یہ چاند کھیلنے کو مانگا تھا---

میں نے تو دے دیا تھا---!

آخری بار

میرے یار---

سر جھکا کر تیرے قدموں پہ میں اک پیار کروں

اشک چھالا تیرے ہونٹوں پر رکھوں---

یہ چمن سانسوں کا تجھ پر واروں---

آنکھ میں رکھ کے تجھے

آنکھ کو بند کروں

الوداع کہہ کے......

تجھے......تجھ سے جدا' لے جاؤں؟

باسمہ آج پھر اسے نظر آ گئی تھی- یوں موٹر چلاتی ہوئی سڑک کے سینے کو روند رہی تھی- جیسے کوئی بطخ پانی کے سینے پر رواں ہو- امان جب کبھی اسے موٹر میں جاتا ہوا دیکھ لیتا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے باسمہ سر پر تاج شاہانہ سجائے --- اسی وقار اور خود اعتمادی سے چلی جا رہی ہے...... جو اس کی فطرت کا خاصہ تھا-

امان اسی وقت ایک جنرل سٹور کے باہر اپنے ایک دوست سے گپ لگا رہا تھا- باسمہ خوب بنی ٹھنی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی تو اس کے دل میں سرخ سرخ آندھیاں سی اٹھنے لگیں-

دنیا اتنی بڑی جگہ نہیں ہے- اس نے سوچا --- مگر جب آدمی ایک شہر میں رہتا ہو اور جدا ہوئے زیادہ سال بھی نہ گزرے ہوں تو ایک دوسرے کا سامنا ہو جانا کچھ ایسی تعجب انگیز بات بھی نہیں ہے-

پہلے بھی کئی بار بازار میں آتے جاتے ہوئے اس نے باسمہ کو یونہی تیز تیز انداز میں موٹر چلاتے ہوئے دیکھا تھا- اور ہر بار --- ایک دل جلا دینے والی گالی' زیر لب فضا میں پھینکی تھی --- حرافہ --- کمینی --- بے حیا! اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے غصے پر قابو پا کے سوچتا --- اس نے باسمہ کو گالی کیوں دی تھی --- ؟

جب کوئی مرد کسی عورت کو طلاق دے دیتا ہے، تو اتنی مکروہ گالی اس کی پیشانی پر لکھ دیتا ہے جسے کوئی مقدس پانی بھی نہیں دھو سکتا۔

اب مزید گالیوں کی گنجائش کہاں تھی؟

اس نے ہلچل کرتے جذبات کو قابو میں لانے کے لئے سگریٹ سلگا لیا۔ وہی سگریٹ جس کا کوٹہ باسمہ نے مقرر کر رکھا تھا---ایک دن میں صرف تین---اور اب دن میں تیس چالیس سگریٹ پی کر دل کو چین نہیں آتا تھا---اور اسے دیکھو، شوکیس کی گڑیا بنی پھرتی ہے۔ ہاں نئی نئی شادی جو رچالی ہے۔ خوش ہے۔ مسرور ہے---اور مجھے کہتی تھی۔ ''جس دن تمہارے علاوہ مجھے کسی اور مرد نے...... چھو لیا تو میری موت واقع ہو جائے گی۔''

''حرامزادی۔ بکتی تھی۔'' اس نے پھر اپنی سانس کی پھنکار کے ساتھ فضا میں زہریلے میزائل کی مانند ایک گالی چھوڑی، جیسے وہ سیدھی باسمہ کے کلیجے میں جا کے اترے گی۔ اب وہ سب کچھ اپنے نئے شوہر سے کہتی ہوگی---اب اپنی ادائیں اس پر نثار کرتی ہوگی---سب بکواس کرتی ہیں یہ عورتیں۔

''یار! تم نے بھی تو وہ سب اپنی نئی بیوی سے کہا ہے--- ذرا اپنا دل بھی تو ٹٹو لو---کیا محبت کا کھیل تم نے دوبارہ نہیں رچایا---اور اس کی سیج تلے رچایا۔ ہرجائی تم ہو کہ باسمہ ہے---؟''

ہاں اس نے دھیرے سے کش چھوڑا--- باسمہ تو ایسی عورت ہے کہ اس سے کوئی بھی مرد بے اختیار پیار کر سکتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے جانے کیسی مٹی سے گوندھا ہے کہ وہ ہمیشہ مہک دیتی رہے گی...... ذرا دیکھو نا یوں جا رہی تھی جیسے مہ و سال اس پر نثار ہوتے ہوئے گزر رہے ہوں......

خوب بن ٹھن کر رہنے لگی ہے- بال بھی کٹوا لئے ہیں--- کتنی مسرور نظر آ رہی تھی--- شاید اس کا نیا شوہر ہر وقت اسے میک اپ میں دیکھنا پسند کرتا ہوگا- اماں کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا اور باسمہ کو چھونے کے تصور سے ہی اس کے تن بدن میں ہزار ہا قمقمے جل اٹھے- باسمہ جادو کی ایسی پٹاری تھی- جس کے کھلتے ہی ہوش اڑ جاتے ہیں- جانے ہوش اڑانے کی ادا قدرت نے اسے بخشی تھی یا اس نے زمانے سے سیکھی تھی- مگر وہ عقل و خرد کے سارے ٹھکانے پھونک کر اس کے آنگن میں آئی تھی- بی اماں کو تو وہ بالکل پسند نہیں آئی تھی اور کوئی عیب نہیں تھا اس میں- بی اماں اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی اپنی بھانجی رشیدہ سے کرنا چاہتی تھی- اکلوتا بیٹا جسے وہ امان اللہ کہتی تھیں اور اسے اللہ کی امان میں دے رکھا تھا-

اس پر یکایک باسمہ نے اپنی مسکراہٹوں کا طلسم چھڑک دیا تو بی اماں کو باسمہ ڈائن کی مانند نظر آنے لگی...... جو ہنستے بستے گھروں پر امر بیل بن کر چمٹ جاتی ہے......

یوں وہ بہو بن کر آئی تو انہوں نے گردن ڈال دی- بیٹا اکلوتا ہو--- ماں کی آنکھ کا تارا ہو--- تو اسے من مانی اور خودسری کرنے کا حق پہنچتا ہے- گھر کا اوپر والا حصہ بی اماں نے بہو اور بیٹے کو دے دیا تھا- ادھر دو کمرے' ایک غسل خانہ' ایک باورچی خانہ اور ایک دالان تھا- دو تین سال بی اماں بہو کے ہاتھ کا پکا کھاتی رہیں- پھر یکایک انہیں بہو کے ہاتھ میں کیڑے نظر آنے لگے- کیوں نظر نہ آتے--- تین سال ہو گئے تھے اور بہو کی کوکھ بنجر تھی-

''یہ عشق کی ماری لڑکیاں' پتہ نہیں کیا کیا کرتی ہیں- کمبختیں کہ ان کی گود ہری نہیں ہوتی- ایسی صورت کو چاٹا کرے کوئی کہ عورت کا حسن تو بچے سے ہے- جس عورت کی گود میں بچہ نہیں اس سے بدصورت کون عورت ہوگی---؟''

''اے یہ من مانیاں کر کے بزرگوں کا دل تو پہلے ہی توڑ دیتی ہیں' انہیں دعا کون دے؟''

یہ تو باسمہ بھی سوچا کرتی تھی کہ دعا لینے کس کے پاس جائے---؟ اے کاش دعائیں بازاروں میں بکتی ہوتیں تو وہ سارے زیور بیچ کر انہیں خرید لاتی...... ویسے تو ہر جتن کیا تھا اس نے--- محبت کی شادی میں ایک دھڑکا ہمیشہ جی کو لگا رہتا ہے- ابھی ایک سال ہی گزرا تھا کہ اس نے لیڈی ڈاکٹروں کے ہاں چکر لگانے شروع کر دیئے- انجکشن' چھوٹی موٹی صفائیاں...... سب کچھ ساس سے بالا بالا کروالیا--- اور تو اور--- کئی رازدار سہیلیوں کی معرفت تعویذ بھی منگوائے تھے...... مگر دعا کا مقفل دروازہ کھلتا ہی نہ تھا- یوں بھی اس کے سر پر ماں نہ تھی- ایک باپ تھا- وہ بھی سدا کا اپاہج' برسوں سے چارپائی پر پڑا تھا- امان گو گھر میں لاڈلا تھا- مگر پانچ سال مسلسل اس نے باسمہ کے سڑکوں پر یوں ناز اٹھائے تھے کہ وہ بیمار باپ کو چھوڑ کر اس کے گھر آ گئی تھی-

ابا جی سے کئی بار اشاروں کنایوں میں دعا کرنے کے لئے اس نے کہا--- مگر پتہ نہیں' باپ سے کیوں اس طرح بات نہیں ہو سکتی-'' جس طرح ماں سے ہو سکتی ہے-

پانچ سال ایک بنجر ڈگر پر ہانپتے کانپتے--- بالآخر اس نے صبر کرنے کی ٹھان لی...... کیونکہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے دو ہی اصول ہیں...... صبر یا جبر......

''پر اب تو بی اماں بھی واشگاف الفاظ میں اسے کوسنے دیا کرتیں اور ہر آئے گئے کے آگے اپنے اکلوتے بیٹے کی نسل بندی کا ماتم کیا کرتیں-

ان روز روز کی لڑائیوں میں ساس بہو کا کھانا الگ ہو گیا-

باسمہ اس میں بھی خوش تھی-

وہ ادھر یوں پڑی رہتی جیسے کسی اچھوت کو رکھا جاتا ہے- روٹی پانی الگ---

برتن الگ

ویسے بھی اسے سہیلیاں بنانے اور گھومنے پھرنے کا زیادہ شوق نہیں تھا بس شام کو اماں کے ساتھ ہی کہیں چلی جاتی ۔ ورنہ گھر میں پڑی رہتی۔

اس طرح ساس بہو کا زیادہ آمنا سامنا بھی نہیں ہوتا تھا ۔ ویسے بھی اگر کسی عزیز کے آ جانے پہ وہ نیچے جاتی یا بی اماں گھڑی بھر کو اوپر آ جاتیں تو وہ اپنا روائتی ادب و احترام برقرار رکھتی --- جی...... جی...... کرتی رہتی......اور ان کی کڑوی کسیلی ہنس ہنس کے پیتی رہتی۔

دل میں بھی غصہ نہیں کرتی تھی۔

جو بات قدرت کے اختیار میں ہو اس پر ناحق جان جلانا حماقت ہے۔ ایک دن اگر انسان یہ سوچ لے کہ وہ تو محض بساط کا مہرہ ہے --- چلانے والا کوئی اور ہے --- تو شہ اور مات کے چکر سے ہی نکل جاتا ہے۔ ہاں اس کی زندگی تب عذاب بنتی جب اسے اماں سے کوئی شکوہ ہوتا ۔ اس گھر میں آتے ہی اس نے سب سے پہلے اماں کو پہچانا تھا۔

ماں کا ایک ہی بیٹا ہو۔ اور نازوں سے پلا ہو --- تو وہ زندگی بھر بگڑا ہی رہتا ہے...... بگڑے ہوئے بچے کو سدا ماں کی آغوش ہی اچھی لگتی ہے --- اگر ماں کی گود سے نکلتے ہی اسے صحیح عورت نہ ملے --- تو پھر وہ طوائف کی گود میں پناہ لیتا ہے --- کہ طوائف ایک کھلی دکان ہے --- وہاں کچھ نہیں ہوتا ۔ ایک پہچان ہوتی ہے --- گاہک کی پہچان --- مرد کی پہچان --- روٹھے ہوئے بگڑے ہوئے بچے کی پہچان --- اپنے گاہک کو طلب گار بنانے کے لئے وہ گھڑی گھڑی روپ بدلتی ہے اور اسے لبھاتی ہے...... یوں اس سے سارے رشتے ناطے چھڑا دیتی ہے۔

جانے باسمہ کو یہ سب کس نے بتایا تھا...... پر یہ سب اس کے لاشعور میں تھا۔ اور اسے امان کو لبھانے کے سارے گر آ گئے تھے۔۔۔ اس لئے اس نے ساری دنیا سے منہ موڑ کر صاف امان سے لو لگالی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے اپاہج باپ کو بھی بھول گئی تھی۔۔۔ وہ ایک نامکمل عورت تھی۔۔۔ بچے کی طرف سے جو کمی تھی وہ اپنی سعادت مندی' انکسار اور خدمت گزاری سے پوری کرنا تھی۔ جس عورت کی گود خالی ہو وہ تو اپنے مرد سے اونچی آواز میں بول بھی نہیں سکتی۔۔۔ باسمہ جھکتے جھکتے امان کے تلووں تک پہنچ گئی تھی۔ مگر خوب صورتی کی ادا کو اس نے برقرار رکھا تھا۔ یوں مسلسل اس کے نخرے اٹھائے جارہی تھی۔ جیسے وہ اس کا اکلوتا بچہ ہو۔ بیوی کی گود میں جب ماں کی شفقت بھی سما جاتی ہے تو عورت پورے کا پورا مرد جیت لیتی ہے۔ یوں امان کو اپنی ہتھیلی کا چھالا بنا کر اس نے ایک ماں سے اس کا بیٹا کلیۃً چھین لیا تھا۔ اس لئے بی اماں کی جلی کٹی کا برا نہیں مانتی تھی۔ آخر اماں اس کو نہ کوستیں تو کس کو کوستیں۔۔۔؟

اور اماں بی تو ادھار رکھنے کی قائل نہ تھیں۔ جونہی امان گھر میں داخل ہوتا۔ ذرا سی دیر اماں بی کے پاس رک کر ان کا حال دریافت کرتا۔ اور پھر سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھاتا۔ اماں بی اپنی محرومیوں کی مالا پرونے لگتیں۔۔۔ ان کی زبان کی نوک دار سوئی کبھی تو اماں کے احساسات کو زخمی کرتی اور کبھی باسمہ کے کلیجہ کے آر پار ہو جاتی۔ ادھر جھروکے میں کھڑی باسمہ۔۔۔ کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔ مگر پھر وہ مصلحت کے برش سے اپنی پیشانی کی ساری شکنیں صاف کر لیتی۔۔۔ اسے ہر حال میں امان کا سواگت پھولوں اور کلیوں کی صورت میں کرنا ہوتا۔ اسے معلوم تھا وہ جس قدر اپنی محبت کا کنواں گہرا کرتی جائے گی۔۔۔ اتنا ہی امان اس کے اندر اترتا چلا جائے گا۔ محبتوں کو نت نئی ادا عطا کرنے سے۔۔۔ عشق مضبوط ہوتا ہے۔

شوہر کو عاشق بنانا ہو تو بوٹی بوٹی اس کے قدموں تلے بچھا دیتے ہیں۔

اور اس کی بانہوں میں پہنچ کر امان سوچا کرتا......

پتہ نہیں باسمہ کیا ہے---؟ کس مٹی سے بنی ہے؟

کئی بار اس نے باسمہ کو الفاظ میں مجسم کرنا چاہا...... مگر اس کے پیکر کے سامنے الفاظ کے پیرہن اتر گئے...... وہ پہلے دن کی طرح آج بھی شاداب تھی بھرپور تھی۔ مسرور تھی۔ کھلی پڑتی تھی---مگر مرجھاتی نہ تھی---مرجھائی ہوئی عورت سے مرد نفرت کرتا ہے--- مرد کو گلاب کی طرح تروتازہ عورت بھاتی ہے---ٹوٹی ہوئی، مسلی ہوئی......شاخ سے گری ہوئی...... بیمار عورت مرد کو اچھی نہیں لگتی۔

پتہ نہیں باسمہ کون سا آب حیات پیتی تھی۔ ابھی تک ویسی ہی تھی۔

اسے نہ تو زندگی سے گلہ تھا نہ زندگی کی محرومیوں سے،اس کی آنکھوں میں امان ہی امان تھا۔ اور جیسے اسے امان کا نشہ دو آتشہ کئے دے رہا تھا۔

اس روز جمعرات تھی۔ اور امان کو دفتر میں دیر ہوگئی تھی۔ وہ باہر نکلا تو سڑک پر اندھیرا اور موٹروں کی بتیاں ایک ساتھ اتر آئی تھیں۔ وہ باسمہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

جمعرات کی شام باسمہ اس کا عجیب انداز میں سواگت کرتی تھی۔ باسمہ کا یہ انداز امان کو بڑا اچھا لگتا تھا۔ اور اس انداز پر وہ ساری رات فدا ہونے کو تیار تھا۔

اور پھر اگلے دن جمعہ ہوتا۔ وہ دیر سے اٹھتے --- سارا دن اور سارے لمحے اپنے ہوتے......

وہ بستر پر پڑا پڑا حکم چلایا کرتا اور باسمہ زرخرید لونڈی بنی ادھر ادھر بھاگ کر اس کا حکم بجالاتی۔ اگر اس روز اس کا کوئی قریبی دوست آجاتا تو وہ اسے بھی وہیں اپنے بیڈ

روم میں بلا لیتا۔ پورا جمعہ اس طرح گزرتا کہ وہ اگلے سارے ہفتے کے لئے تازہ دم ہو جاتا---اور یہی چھٹی کا مقصد بھی ہوتا ہے۔

اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اسے جمعرات کو ہی دفتر میں دیر ہو جاتی تھی۔ شاید وہ سارا ہفتہ سستی کر کے اپنا کام ادھورا چھوڑ جاتا تھا۔ جسے جمعرات کو ہر صورت میں مکمل کر کے جانا ضروری ہوتا تھا۔ آج بھی وہ کام ختم کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا۔ موٹر میں بیٹھتے ہی اس نے سگریٹ سلگایا---ایک کش لگا کے دھواں چھوڑا---دھواں اس کے چہرے کے آگے پھیل گیا اور یک بیک اسے باسمہ کی خوشبو آنے لگی۔ تھکاوٹ میں اسے باسمہ کی اشد ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اس کی انگلیوں کے پوروں میں شاید طلسماتی عناصر لگے ہوئے تھے کہ دھیرے دھیرے مدہوش کر دیتی تھی۔

رات---کلیاں---اور چاندنی۔

بس یہی باسمہ کی تعریف تھی مختصر مختصر۔

وہ زیر لب مسکرایا۔

باسمہ رات تھی۔

پراسرار رات...... پرفریب نشہ آور......اور مستی سے بھری ہوئی۔

آدمی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے رات کے جادو سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ اپنا آپ اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

کلیاں......

کلیاں منہ بند ہوں تو بھی خوبصورت لگتی ہے۔ کھلتی ہیں تو اور دلکش ہوتی جاتی ہیں۔ ان کلیوں کے کیا کہنے ہیں جو ایک درمیانی اسٹیج پر آ کر رک جاتی ہیں۔ تھوڑا سا کھل کر

یوں ساکت ہو جاتی ہیں- جیسے کسی حسینہ نے ہنستے ہی دوپٹے کا آنچل دانتوں میں دبا لیا ہو- باسمہ اسی درمیانی اسٹیج پر آ کر رک گئی تھی-

نہ جانے امان کو ہمیشہ یوں کیوں لگتا تھا کہ باسمہ پوری طرح کھلی نہیں ہے- نہ وہ کلی ہے--- نہ پھول ہے- درمیان میں کھڑی کھڑی آفت بن گئی ہے- اور اس پر سے سات آٹھ سال گزر گئے تھے-...... کلیوں کی طرح دھیرے دھیرے مہکتی رہتی--- پھولوں کی طرح خوش رنگ نظر آتی رہتی--- حالانکہ اب تک اسے پتی پتی ہو کر بکھر جانا تھا- بلکہ ان پتیوں کو بھی--- پلنگ کی پائینتی تلے پامال شدہ راکھ میں مل جانا چاہیے تھا--- آخر عورت کو خاک ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے-؟

چاندنی---!

ایک کشادہ مسکراہٹ امان کے لبوں پر پھیل گئی-

باسمہ کو دیکھ کر بے اختیار چاندنی کا خیال آتا تھا- جہاں باسمہ ہوتی وہاں چاند ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا...... جانے اس کے اردگرد اتنا اجالا کیوں ہوتا---؟ اس کی ذات کا اجالا تھا--- یا اس کی محبت کی روشنی- امان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس مثال کو کس طرح واضح کرے؟ اور کیوں وہ باسمہ کو چاندنی سے ہم آہنگ کر رہا ہے---

مگر وہ جانتا تھا--- وہ اس وقت کیا سوچ رہا تھا- اندھیرے اجالے میں جو عورت ایک جیسی محسوس ہو اسے چاندنی تو کہا جا سکتا ہے نا؟ فرق صرف یہ ہے کہ آپ چاندنی کو چھو کر نہیں دیکھ سکتے مگر اس عورت کو رگ جاں کے قریب محسوس کر سکتے ہیں-

جو بھی ہے-

امان نے سگریٹ کا آخری ٹکڑا شیشہ کھول کر پھینکا اور سوچا-

زہر ہے--- الکوحل ہے--- چرس ہے---

نشے کی طرح لگ گئی ہے- کتنی عجیب بات ہے کوئی شوہر اپنی بیوی کے بارے میں ایسا سوچے- اور وہ بھی شادی کے آٹھ سال بعد---

جبکہ اس نے بچے کی صورت تک نہیں دیکھی-

موٹر گھر کے اندر داخل ہوگئی تھی- اس نے اسے گیراج میں بند کیا- وہ جانتا تھا- باسمہ نے اس کے اوپر آنے کا احساس رکھا ہوتا ہے- پچھلے موڑ سے جب وہ ہارن دینے لگتا ہے تو وہ اندازوں سے کھیلنے لگتی ہے-

اب وہاں ہوں گے--- اب یہاں ہوں گے--- اب گیٹ کے اندر آئے ہوں گے--- اب موٹر گیراج میں بند کر کے اوپر آ رہے ہوں گے-

اور اسی حساب سے وہ ہمیشہ پہلی سیڑھی پر مل جایا کرتی- اماں بی کو چاند چکور کا یہ ملاپ پسند نہیں تھا' اس لئے وہ کئی بار حائل ہو جاتیں اور جتنی دیر بھی ممکن ہوسکتا- امان کو اوپر جانے سے روکے رکھتیں وہ اگر اٹھ کر چل دیتا تو اماں بی پیچھے پیچھے لپکتی جاتیں--- پھر وہ پہلی سیڑھی پر پہلا قدم رکھ کے خود ہی رک جاتا- مبادا اماں بی اوپر تک چلی آئیں اور ان ریشمی بانہوں کے حلقے کا ہار بننے سے پہلے محمل کے اندر چلی آئیں-

''آج تو بڑی دیر لگا دی بیٹا؟''

اماں بی ہر روز اسی سوال سے ابتدا کرتی تھیں- یہی سوال اگر اس کی بیوی پوچھتی تو وہ اسے پھاڑ کھاتا-

مگر اماں بی کو ہر روز بڑے سکون سے ایک ہی جیسا جواب مل جاتا-

''بس اماں بی' آج دفتر میں کام کچھ زیادہ تھا-''

حالانکہ جب دیر نہیں ہوتی تھی' تب بھی اماں بی یہی سوال کرتیں--- چند لایعنی سوالوں کے جواب دے کر وہ اوپر کو بھاگتا--- بے تابی اس کے ہر قدم سے ظاہر

ہوتی۔

باسمہ جانتی تھی جب ماں بیوی بن کر نا موزوں سوالات کر رہی ہو تو اس وقت بیوی کو سرتا پا ماں بن جانا چاہئے---یوں آغوش وا کرنی چاہئے‘ جیسے کہہ رہی ہو۔

’’تم آ گئے ہو۔تو قرار آ گیا ہے---بہار آ گئی ہے۔‘‘

بس اس کے سواگت کی ہر ادا میں یہی فقرہ رچا ہوتا---اسی لئے تو وہ اوپر جانے کے لئے بے قرار نظر آتا۔اور بی اماں اس کے اس انداز پر دلفگار رہتیں---ان کا خیال تھا بہو نے ان کے لعل پر ٹونے ٹوٹکے پھونک دیئے ہیں۔

آج بھی جب وہ جلدی جلدی سیڑھیوں کا صحرا پار کر کے اپنی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔اماں بی درمیان میں آ گئیں---بے موقع ہی بولیں۔

’’کیسا اداس اداس اور دکھی لگ رہا ہے---تیری اجاڑ زندگی نے مجھے روگی بنا دیا ہے۔‘‘

’’کیوں اماں بی---خدانخواستہ میری زندگی کو کیا ہوا ہے---؟‘‘

امان نے ہنس کر کہا۔’’میں تو بہت مطمئن اور خوش وخرم رہتا ہوں۔‘‘

’’خاک---ذرا اپنا چہرہ دیکھو---محرومیاں‘ بن جھروکوں کے جھانک رہی ہیں۔‘‘

’’ہائے بچے کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔نو سال میں تو ایک مرجھایا ہوا درخت بن گیا ہے۔بچوں سے زندگی میں ہر روز بہار آتی ہے۔‘‘

’’اماں بی---‘‘امان زور سے ہنسنے لگا۔جیسے ماں کا مذاق اڑا رہا ہو۔

’’دنیا میں ہزاروں لوگ ہیں۔جن کے بچے نہیں ہیں۔تو کیا وہ زندہ نہیں ہیں۔؟‘‘

''مگر بیٹا' تجھ میں اور ان میں بہت فرق ہے---تو نے تو اپنے آپ کو خود زندہ درگور کرلیا ہے۔''

''کیوں اماں بی--- کیسے بھلا؟''

ایک بانجھ عورت کے ساتھ نباہ کرنا' زندہ درگور ہونا ہے۔ایک لاش کے پاس کتنے ہی تروتازہ پھول رکھ دو۔ مرجھا جاتے ہیں۔ مرجاتے ہیں۔''

''اماں!......اماں بی......امان کے لہجے میں تناؤ تھا۔''یہ سب اللہ کے فیصلے ہیں۔ اس کے کاموں میں دخل اندازی اسے پسند نہیں......اور مجھے تو ذرا بھی ملال نہیں۔''

''اے ملال کیوں نہیں---چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔''

امان چپ کر کے اوپر چڑھنے لگا۔ اب کچھ کہنا فضول تھا۔ وہ خوشی کا مزید اظہار کر کے ایک اور مصیبت مول نہیں لینا چاہتا تھا---غنیمت کہ اس کی ماں اسے دکھی سمجھ رہی تھی۔

''تم اک ذرا---اشارہ تو کرو۔''''وہ سیڑھیاں چڑھتے امان کو دیکھ کر بولیں۔ ''اچھی سے اچھی دولہن لے آؤں۔ دنیا میں کیا لڑکیوں کا کال پڑا ہے۔جس پر ہاتھ رکھ دو وہی لے آؤں---اس گھر میں' میں بچوں کی آوازوں کو ترس گئی ہوں---یہ گھر نہیں مرگھٹ لگتا ہے۔''

''تو پھر اللہ سے دعا کیجئے اماں بی۔''

امان نے تلخی سے کہا۔

''دعا کر کے تو زبان گھس گئی ہے۔''

''اماں بی' دعاؤں سے زبان گھستی نہیں' مقدس اور پرتاثیر ہوتی ہے۔صرف کوسنوں سے زبان گھستی ہے۔''

''ہائے مرجاؤں میں--- بی اماں نے سینے پر دو ہتڑ مارا--- اس ڈائن نے میرا لال بدل کر رکھ دیا ہے- ماں سے کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے---؟''

امان پھر خجالت سے ہنسنے لگا-

''اماں بی- اب آپ ان فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع نہ کیا کریں- زیادہ وقت اللہ اللہ کرنے میں گزارا کریں- دنیاداری اور اس کے بکھیڑوں سے کنارہ کش ہو جائیں-''

''سیدھے سیدھے کیوں نہیں کہتا کہ اب مجھے مرجانا چاہئے- ایک کونے میں بیٹھ کر موت کا انتظار کرنا چاہیے- میں اب جی کیوں رہی ہوں''......

اماں بی نے روایتی انداز میں رونا شروع کر دیا-

اس ڈرامے کا یہی کلائمکس ہونا تھا--- سیڑھی کے قریب سایہ بن کے کھڑی باسمہ فوراً پیچھے ہٹ گئی- اب روئے سخن اس کی طرف آنے کو تھا--- جب کوسنوں کا مینہ برستا تھا تو زیادہ تر بوچھاڑ باسمہ کی سمت ہی آتی تھی-

''اماں بی---'' امان پھر رک گیا- نیچے اتر گیا- ماں کو چپ کرایا- پلنگ پر بٹھایا اور بولا-

''معاف کر دیں' اگر منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہو تو- آپ بھی تو دفتر سے آتے ہی پیچھے پڑ جاتی ہیں-- کبھی تو کوئی اور بات بھی کر لیا کریں-''

ماں کو چپ دیکھ کر وہ پھر سیڑھیوں پر چڑھنے لگا- وہ روتے روتے جیسے غش کی حالت میں بولیں-

''فہمیدہ اب بھی تیرے انتظار میں بیٹھی ہے- اگر ذرا سی ہاں کہہ دے تو......

''اماں بی- آپ کب سمجھیں گی کہ باسمہ کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے- میں اس

بے آسرا کو کیوں چھوڑ دوں- کیا خبر میری قسمت میں بچے ہی نہ ہوں-''

''کیسی فال بد منہ سے نکالتا ہے--- بدقسمت تو میں ہوں- جوانی میں بیوگی دیکھی......اور بڑھاپے میں اپنے بچے کی نامرادی دیکھ رہی ہوں-''

''اچھا میں چلتا ہوں-'' امان نے کہا-

اماں بی ان سنی کرتے ہوئے بولیں-

''مجھے ڈاکٹر نے سب بتا دیا ہے--- باسمہ کی گود کبھی ہری نہیں ہو سکتی- یہ تو پیدائشی بیراگن ہے......میرے بیٹے کو کھا گئی ڈائن-''

امان تیز تیز اوپر چڑھنے لگا--- اماں بی کی آواز اتنی ہی تیزی سے اس کا پیچھا کرنے لگی-

''میں نے عصمت کو لکھ دیا ہے کہ فہمیدہ کو چند دنوں کے لئے ہمارے ہاں بھیج دے- ہاں''......

............☆............

رات کو جب سونے کا وقت آیا- تو باسمہ نے اپنی معطر انگلیاں اس کے بالوں میں چلاتے ہوئے کہا-

''تو فہمیدہ بیگم آ رہی ہے اس گھر میں---؟''

''تم اماں کی باتوں کا برا نہ مانا کرو-''

''میں نو سال سے سن رہی ہوں یہ باتیں- کیوں برا مانوں گی؟ میں تو یہ کہہ رہی تھی آخر اماں کوئی نہ کوئی محاذ کھول کر ہی دم لیں گی-

''پتہ نہیں عورتیں اتنی بدگمان کیوں ہوتی ہیں؟''

''مرد جو بے ایمان ہوتے ہیں-''

''تو الو کی پٹھی ہے---تو مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔''

''جانتی ہوں---'' باسمہ ہنسنے لگی۔ امان کے پیار کا یہی انداز تھا۔ وہ ہمیشہ اظہار محبت گالی گلوچ اور تشدد سے کیا کرتا تھا۔

''مگر اس کو نہیں جانتی جو آ رہی ہے۔''

''دیکھو باسمہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ مجھے تیرے ساتھ رہتے ہوئے کبھی احساس محرومی نہیں ہوا--- بچہ دینا تو خیر خدا کے اختیار میں ہے۔ مگر جو کچھ کوئی عورت کسی مرد کو دے سکتی ہے وہ تو مجھے دے رہی ہے اور تیرے سوا کوئی عورت بھی خوش نہیں رکھ سکتی۔''

''خیر اتنی بڑی بات نہ کہو...... ہاں مجھے اگر کسی روز اپنی کسی بات سے یہ کہہ دو گے کہ میں تم سے اکتا گیا ہوں' چلی جاؤ---تو میں چلی جاؤں گی۔''

''سچ مچ--- کھاؤ میرے سر کی قسم'' امان نے شرارت سے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

''لو اپنے سر کی قسم کھاتی ہوں۔'' باسمہ نے اس کے بالوں میں سے ہاتھ نکال کر اپنے سر پر رکھا۔

''یار تو بڑی پیاری چیز ہے۔'' امان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔

''اگر دنیا میں ہر شخص کو ایسی بیوی مل جائے تو کیا ہو۔''

''یہ دنیا مردوں کی جنت بن جائے۔''

اس پر امان بے تحاشا ہنسنے لگا...... پھر اس کی سمت کروٹ بدل کر بولا۔

''مجھے معلوم ہے تیری جنت میری بانہوں میں ہے۔''

''اری تو کیا جانے تیری بانہیں کیسی ہیں؟--- بتا دوں تو بانس پر چڑھ جائے

گی - وہ بانہیں کبھی کمزور نہیں ہوتیں جن کے حلقے میں ایک اچھا خاصا مرد بچہ بن جاتا ہے اور سارا تحفظ اسے انہی بانہوں کے آس پاس ملتا ہے۔''

''امان!'' باسمہ نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''محبت کرنے والی عورت تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی - اس کو کوئی دوسرا چھونے والا کبھی پیدا بھی ہو سکتا ہے۔ پھر مرد کس طرح بار بار محبت کر لیتا ہے۔''

''بے وقوف' مرد بھی بار بار محبت نہیں کر سکتا - صرف اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔''

''مگر دیکھو نا - مرد کتنی آسانی سے دوسری شادی کے بارے میں سوچ لیتا ہے۔''

''کیا عورت نہیں سوچتی؟''

''نہیں --- کم از کم میرے جیسی عورت تو خیال بھی نہیں کر سکتی کہ وہ اپنا آپ کسی دوسرے مرد کے حوالے کر دے گی - مجھے یوں لگتا ہے - اگر تمہارے علاوہ کبھی کسی نے مجھے چھو لیا تو میں مر جاؤں گی۔''

''واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے - مجھے پتہ چل گیا ہے تمہاری موت کس طرح واقع ہو سکتی ہے --- جب کبھی مارنا مقصود ہو گا ---''

وہ شرارت سے کہہ گیا۔

''ہاں صرف بے وفائی کرنا' کج ادائی کرنا - میں مر جاؤں گی۔''

''بکواس نہ کر --- سستے ناول پڑھ کے فلمی ڈائیلاگ بول رہی ہے...... یہ کیا مرنا مرنا لگا رکھا ہے - نو سال ہو گئے میرے ساتھ رہتے ہوئے اور ابھی تجھے میرا پتہ ہی نہیں چلا ---؟''

پتہ نہیں ان نو سالوں نے مجھے وہ تحفظ کیوں نہ دیا --- وہ دل میں سوچنے لگی' جس سے میرے دل کی فصیل مضبوط ہو جاتی...... دل تو ایک ایسا دیا ہے - جو سدا تیز و تند

آندھیوں کے دھانوں پر پڑا پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' امان نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

''کہہ دوں۔۔۔؟''

''پہلے یوں کرو ایک پیالی گرم گرم کافی بنا کر لاؤ۔ پھر ساری رات باتیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اٹھ کے بھاگی۔

امان کی عادت تھی، وہ آدھی رات کو اسے ضرور جگاتا تھا۔ پانی بھی پینا ہو تو کہنیاں مار مار کر اسے جگاتا، حالانکہ بستر کے پاس پانی کا فلاسک پڑا ہوتا۔ بتی بجھانی ہو۔۔۔ کوئی کتاب ڈھونڈنا ہو۔۔۔ اور تو اور۔۔۔ آدھی رات کو وہ عجیب و غریب فرمائشیں کرنے لگتا۔

''اس وقت میرا پراٹھا اور اچار کھانے کو جی چاہتا ہے۔''

''خیر تو ہے'' باسمہ مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھتی۔

تمہاری طبیعت کے رنگ تو حاملہ عورتوں جیسے ہوتے جا رہے ہیں۔

''دیکھو بحث نہ کرو۔۔۔ ورنہ چلا چلا کر بی اماں کو اٹھا دوں گا۔''

''نہ ...... نہ''...... اماں بی کے اٹھانے سے باسمہ بہت ڈرتی تھی۔ اماں بی تک آواز پہنچانا ایسے تھا جیسے جنات کی پوری فوج کو اٹھا دیا ہو......

''رات بھر وہ اسے ستاتا۔۔۔ رات بھر فرمائشیں کرتا۔۔۔ رات بھر وہ ایک ٹانگ پر کودا کرتی۔۔۔ لاڈلے بچے کی طرح وہ انمول انوکھی فرمائشیں کرتا رہتا۔۔۔ اور مامتا کی ماری ماں کی طرح...... ہنس ہنس کر ہر فرمائش پوری کرتی رہتی۔۔۔ صبح اسے دفتر بھیج کر وہ جی بھر کے سوتی...... دس گیارہ بجے اٹھ کر وہ ہانڈی روٹی کا فکر کرتی۔۔۔

تبھی تو اماں بی ہر آئے گئے سے بلند آواز میں کہتی رہتیں۔

''نحوست کی ماری ہے میری بہو۔ دن چڑھے تک سوتی ہے۔کبھی اللہ رسول کا نام تو لیا نہیں---ایسوں کو تو اللہ نامراد ہی رکھتا ہے۔''

باسمہ یہ سب سن کر دل پر جبر کر لیتی۔ اللہ نے اس کو نامراد ہی پیدا کیا تھا۔ ہر ڈاکٹر نے مختلف انداز میں اسے یہی کہا تھا۔

''دیکھو بی بی۔ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔ وہ قدرت والا معجزے تک دیکھا دیتا ہے۔مگر آپ......آپ......

اور ایک ہی بات کو بار بار سننے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اس لئے اب دوا دارو سے بے نیاز ہو کر وہ معجزے کی منتظر رہتی تھی۔

اسی ایک کمزور سی امید پر وہ زندگی کی جوت جگائے بیٹھی تھی...... پتہ نہیں وہ ان دونوں میں سے کس پر زیادہ بھروسہ کرتی تھی---؟ امید موہوم تھی۔ اور شوہر مرد تھا --- دونوں اعتبار کے قابل نہیں تھے۔ اسے اکثر یوں محسوس ہوتا' وہ ایک کاغذ کی کشتی ہے--- جو تیز و تند دھارے کے دہانے پر رکھ دی گئی ہے۔ اس کو بس ایک ہی راستہ نجات کا نظر آتا تھا کہ وہ امان کو فقیر کر لے' اسیر کر لے---!

اسی جتن میں وہ بوند بوند لہو جمع کر کے محبت کا چراغ جلائے بیٹھی تھی۔

☆

اس روز وہ بہت عرصے بعد ابا کی خبر لینے گئی تھی اور ان کی دگرگوں حالت کو دیکھ کر رات کو وہیں رک گئی تھی۔ ورنہ امان تو کبھی رات کو وہاں رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چاہے رات کے بارہ بجے لے کر آئے--- ساتھ ہی لے آتا تھا--- وہ کہتا تھا اپنے بیڈ روم میں وہ باسمہ کے بغیر ایک رات بھی نہیں رہ سکتا---

آج تو وہ خود بھی نہ رہنا چاہتی تھی کیونکہ پچھلے ایک ہفتے سے گھر میں فہمیدہ آئی ہوئی تھی--- اور اماں بی تسبیح ہاتھ میں لئے اپنا پرانا منتر پھونکنے کے منصوبے باندھا کرتی

لیکن آج ہی اباجی پر فالج کا دوسرا حملہ ہوا تھا- ان کا دم آنکھوں میں آ کر اٹک گیا تھا اور گھر میں نوکر کے علاوہ کوئی نہیں تھا- اس لئے امان خود ہی اسے چھوڑ کر آ گیا تھا- واپس آیا تو رات کے بارہ بج رہے تھے- باسمہ نے بہت سمجھا کے بھیجا تھا کہ فرج میں کھانا رکھا ہے- اور روٹیاں پکا کے اس نے اوون میں رکھ دی تھیں- ضرور کھا لینا--- لیکن اس کا کھانے کو دل نہیں چاہا- کبھی یہ کام اپنے ہاتھ سے کیا جو نہیں تھا- یونہی لیٹ کر ورق گردانی کرنے لگا- ساتھ والے تکیے پر ہاتھ رکھا تو باسمہ کے بالوں کی مہک اڑی- تب اسے اس کے گالوں کی تپش یاد آ گئی اس نے چونک کر دیکھا تو تکیے پر باسمہ کا ایک بال بھی چمٹا ہوا تھا- اس نے اپنی انگلیوں میں بال کو اٹھا کر دیکھا- کیا ایک بال کے سہارے رات گزر سکتی ہے- ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے میں آہٹ ہوئی نظر اٹھا کر دیکھا تو فہمیدہ کھانے کا ٹرے اٹھائے چلی آ رہی تھی-

''اماں بی مچان لگائے بیٹھی رہتی ہیں-'' اس نے دل میں سوچا---''انہیں شیر کے شکار کا شوق ہے شاید؟''......

''کیا بات ہے فہمیدہ؟'' وہ خوف کے مارے اٹھ کر بیٹھ گیا-

''جی......جی......خالہ بی نے آپ کے لئے کھانا بھیجا ہے-''

''مگر میں تو کھانا کھا کے آیا ہوں-'' امان نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا-

''اچھا--- وہ زرد ہو گئی- ''مجھے معلوم نہیں تھا-''

''کوئی بات نہیں-'' امان نرمی سے بولا- ''ویسے تم یہ ٹرے اندر باورچی خانے میں رکھ دو- صبح اٹھ کر کھا لوں گا- اور بی اماں سے کہہ دینا وہ میری فکر بالکل نہ کریں-

اوپر کچھ بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے- صبح چائے پینے کے لئے خود نیچے آجاؤں گا-''

وہ ٹرے اٹھائے باورچی خانے میں آگئی- اندر ٹرے رکھ دیا اور پھر انگلی پر دوپٹہ لپیٹتے ہوئے واپس آگئی...... باہر جاتے جاتے ایک دم پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ گئی-

''ارے یہ کیا کر رہی ہو!''

''میں آپ کے پاؤں دبا دوں---؟''

''میں کوئی کھیتی باڑی کر کے آیا ہوں---موٹر میں ہی تو بیٹھ کر آیا ہوں-

''موٹر چلانے سے بھی ایک پیر تو دکھنے لگتا ہے-

(سب بی اماں کی ہدایات پر عمل ہو رہا ہے)

اس نے بڑے غور سے فہمیدہ کی جانب دیکھا- وہ بڑے سبھاؤ سے بستر کی پائنتی پر بیٹھی تھی- اس کی عمر کوئی بائیس تیئس برس کی ہوگی- یہ اماں بی کی دوسری لاڈلی بھانجی تھی- پہلی بھانجی رشیدہ تھی- جس کو انہوں نے بچپن میں مانگ لیا تھا- مگر باسمہ نے امان کو اسیر کر کے یہ مانگ توڑ دی تھی- پھر اس کی شادی ہوگئی- اب اماں بی نے اپنی ساری امیدیں فہمیدہ پر مرکوز کر دی تھیں- اس وقت امان کو احساس ہوا کہ جوان لڑکی کو غور سے دیکھنا اچھا لگتا ہے- فہمیدہ بوٹے سے قد کی لڑکی تھی--- جسے بہت چھوٹا قد کہتے ہیں- قد کی مناسبت سے اس کا جسم فربہ تھا- گداز اور بھرا بھرا--- رنگ سانولا تھا--- آنکھیں موٹی اور پھیلی پھیلی تھیں- جن میں اس نے بھر بھر سلائیاں سرمے کی ڈال رکھی تھیں سرمہ تھا کہ چھلک رہا تھا اور رنگ تھا کہ دمک رہا تھا-

اس کے چہرے پر اس وقت وہ ملاحت تھی جو جوانی کا خاصہ ہوتی ہے- اور نقش و نگار سے ماورا ہوتی ہے- وہ اس کا باسمہ سے مقابلہ کرنے لگا- باسمہ اب بھی اس کے مقابلے میں بے انتہا حسین تھی- اس کے باوجود امان نے فہمیدہ کو وہاں سے اٹھنے کے

لئے نہ کہا۔

یکا یک فہمیدہ نے ہاتھ بڑھا کر امان کے پاؤں کو چھولیا۔

(یہ ہدایت نمبر تھی شاید)

امان کو ایسے لگا جیسے بجلی نے چھولیا ہو۔ اس کے گرم گرم گیلے ہاتھ۔۔۔ بچوں کے ہاتھوں کی طرح عجیب لگے تھے۔ اچھے بھی اور گدگدی کرنے والے بھی۔۔۔

امان نے جھٹ اپنا پاؤں اٹھالیا اور بولا۔

''کیا کرتی ہو؟''

''اللہ آپ ہمیں دبانے دیں نا۔''

نئی نئی طوائف زادی کی طرح فہمیدہ نے اٹھلا کر کہا۔

''دیکھو تم اسی وقت اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔'' امان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''آپ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟''

اس نے اپنی کاجل بھری نظریں اٹھا کر امان کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔

''کہ مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں۔۔۔ میں جب سے آئی ہوں۔ میری طرف دیکھتے بھی نہیں۔۔۔ کیا میں اتنی بری ہوں؟''

(یہ ہدایت نمبر تھی شاید)

امان احساس کا جنگلہ پھلانک کر نکل جانا چاہتا تھا مگر خاردار تاروں میں الجھ گیا۔

کم بخت کی آنکھیں کتنی کالی تھیں۔ اماوس کی رات کی طرح۔۔۔ کالی کالی......

اور ہوحق بولتی۔۔۔ رات کے پچھلے پہر آنکھوں کا کاجل رات کے اندھیرے سے جاملتا ہے۔۔۔...... امان نے اپنے دل میں ایک لہر سی محسوس کی...... کسی نوجوان لڑکی سے شادی کے نو سال بعد یوں ملاقات کرنا عجیب لذت دیتا ہے۔۔ جس طرح ہر روز سگریٹ

پینے والا آدمی ایک روز ولایتی سگار کا کش لے لے۔ کڑوا، سخت مگر پرلطف۔

ایک دو کش لے لینے سے سگار کی عادت نہیں پڑتی۔ پھر بھی وہ اچھے شوہروں کی طرح ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔

''آؤ میں تمہیں نیچے چھوڑ آؤں۔ اچھی بچیاں ایسی باتیں نہیں کرتیں۔

(ہوں تو اچھی بچیاں رات کی چپ ندی میں کنکر پھینک کر ہلچل مچا سکتی ہیں۔)

جانے اس نے ''اچھی بچی'' والی اصطلاح کس خوف سے استعمال کی تھی۔ مگر اس ''اچھی بچی'' کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ڈر رہا تھا۔۔۔ معلوم تھا، ہتھیلی میں گرم عورت ہو گی۔

اچھی بچی تو کب کی رخصت ہو چکی۔۔۔!

گیا تو نیچے چھوڑنے تھا اس کو۔۔۔ مگر اپنی نیت نیچے چھوڑ آیا۔ واپس آیا تو باسمہ کی طلب کچھ اور بڑھ چکی تھی۔ جلدی سے دروازہ بند کر کے اس نے کنڈی لگا لی۔۔۔ گویا ہوا چغل خور ہے۔ اور در در پہ جا کے اس کی نیت کا ڈھنڈورا پیٹتی پھرے گی۔

کمال ہے۔۔۔ اس نے اپنے دل میں پہلی مرتبہ ایک مبہم سا خطرہ محسوس کیا۔ انسان کا نفس بڑا کمزور کیڑا ہے۔ دنیا میں کوئی شے اتنی کمزور اور بے اعتبار نہیں جتنا یہ کم بخت نفس ہوتا ہے۔۔۔!

صبح تیار ہو کے نیچے گیا تو فہمیدہ ناشتہ بنا کے میز کے پاس کھڑی تھی۔ جانے اتنی صبح وہ کیسے تیار ہو گئی تھی۔ وہی دھلا دھلایا صبیح چہرہ اور کاجل کے حصاروں میں پھیلی کالی کالی آنکھیں۔۔۔ چھوٹے سے سراپا پر چپکا ہوا پھول دار سوٹ۔۔۔ امان آ کر بیٹھا تو اس طرح ناشتہ کرانے لگی جیسے جنم جنم سے اسے جانتی ہو۔ اونہہ...... تو یہ بھی اماں بی کی کارستانی ہے۔

ناشتہ کرتے کرتے اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اپنے دونوں سانولے سلونے

ہاتھ گود میں رکھے چپ چاپ بیٹھی تھی- امان کی نظر اس کے ہاتھوں پر اٹک گئی---کوئی خاص بات نہیں تھی ان ہاتھوں میں- انگلیاں بھدی اور پوریں موٹی تھیں---ٹیڑھے میڑھے ناخنوں پر گہری عنابی نیل پالش لگی تھی-مگر وہ ہاتھ انگاروں کی مانند دہک رہے تھے-

امان کا دل چاہا چھو کر دیکھے-

اس نے گھبرا کر نظریں فہمیدہ کے چہرے پر ڈالیں-قریب بیٹھنے سے شاید اس کی گول مول ناک پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے-سرمئی گردن کے تلے جہاں دوپٹہ ابھاروں کو ڈھانپے ہولے ہولے ہل رہا تھا- دل کے اندر ایک حشر سا بپا تھا- جانے وہ حشر امان کیوں محسوس کر بیٹھا---؟

امان کھڑا ہو گیا- منہ پونچھا-

وہ خدا حافظ کہنے باہر تک آئی-

لو میاں--- آج تم ایک معمولی سی لڑکی سے خوف کھا بیٹھے ہو--- ڈر رہے ہو---

ڈر کس بات کا ہے؟

امان نے جھک کر موٹر کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا-کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا- ہر انسان اپنی بربادی کا خود ذمہ دار ہوتا ہے-

اتنی سی بات یاد رکھنا-

☆

دفتر سے سیدھا باسمہ کو لینے چلا گیا-مگر وہ تو اباجی کو لے کر ہسپتال چلی گئی تھی ان کی زبان بند ہو گئی تھی-جسم کا ایک حصہ ناکارہ ہو گیا تھا- حالت سنورنے کی بجائے بگڑ رہی

تھی۔ ڈاکٹروں کی ہدایت پر انہیں ہسپتال لے جانا پڑا۔

ہسپتال میں کوئی کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو۔ زیادہ دیر نہیں بیٹھا جا سکتا وہاں سے اٹھ کر وہ دوستوں کے ساتھ آوارگی کرتا رہا--- کھونٹے سے بندھے بندھے نو سال ہو گئے تھے۔ اس لئے آوارگی بھی کچھ مزہ نہیں دے رہی تھی--- نو سال بعد' بازاروں' ریستورانوں اور سینماؤں کی طرف آیا--- تو یوں لگا--- زمانہ بدل گیا ہے--- خوش فکروں کی کمی نہیں--- زمانہ کتنا تیز رفتار ہے۔ رک جانے والوں کا انتظار نہیں کرتا--- یوں لگ رہا تھا جیسے وہ زمانے سے پیچھے رہ گیا ہے۔ گھر جانا چاہتا تھا' مگر گھر جانے کے خیال سے ہی ڈر لگ رہا تھا---

''پھر بھی جب رات کے بارہ بجے وہ ڈرتے ڈرتے گھر میں داخل ہوا تو--- وہ کالی کالی آنکھیں بلی کی سی تیزی لئے اس کی طرف بڑھیں۔

جانے وہ کیوں جانتی تھی کہ آج بھی امان اکیلا آئے گا۔

''آج بھی آپ کھانا کھا آئے ہیں یا کھائیں گے؟''

''کھاؤں گا۔''

بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

''آ جایئے پھر---'' وہ جادو کے زور سے اس کے پیچھے باورچی خانے کی طرف کھنچتا چلا گیا۔

بی اماں نے اپنے کمرے سے نکل کر اس طرح جھانکا جیسے حملہ کرنے سے پہلے دانا جرنیل محاذ کا جائزہ لیتا ہے اور پھر تسلی کر کے اندر چلی گئیں۔

''میاں' اندھے ہو کے نہ چلو۔ یہ تمہاری ڈگر نہیں ہے۔''

''خالی بی نے بتایا تھا' آپ گوشت میں بڑیاں بہت پسند کرتے ہیں۔ آج میں

نے اپنے ہاتھوں سے پکائی ہیں۔''

بے اختیار اس نے فہمیدہ کے ہاتھ کی طرف دیکھا گہرے سانولے ہاتھ گہری نیل پالش---کوئی دلکشی نہ تھی ان ہاتھوں میں---مگر انگارہ کیوں لگ رہے تھے۔

اماں بی کی ساری ہدایات سامنے آ رہی تھیں۔اور بھرے بھرے ہاتھوں سے پوری کی پوری عورت جھانک رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

ہر عورت ایک نیا جزیرہ ہوتی ہے جسے ''دریافت'' کرنے کی ضرورت ہوتی ہے---مگر دریافت کرنے کا عمل کس قدر خوبصورت ہے۔ ہر نوجوان لڑکی چاہتی ہے' مرد اپنی دیوانگی کا کولمبس بن جائے۔

اور دیوانہ وار اسے کھوجے--- تلاش کرے--- فطرت کے پردے اٹھائے---

لباس کی طرح عورت کے سب رنگ نرالے ہوتے ہیں......اور جانے یہ لڑکیاں ان دیکھے جزیرے بن کر مردوں کے اردگرد کیوں منڈلاتی ہیں؟

''ذراسی دیر کو باسمہ سائے میں چلی گئی--- بیوی خواہ کتنی بھی حسین کیوں نہ ہو جب سائے میں چلی جاتی ہے تو اس کو گرہن لگ جاتا ہے۔

ذراسی آنکھ مچولی کھیلنے کو کس مرد کا دل نہیں للچاتا۔؟

اگر عزرائیل کسی جوان عورت کے روپ میں آتا تو مرد نزع کے وقت بھی آنکھ مچولی کھیلنے سے باز نہ آتا۔

فہمیدہ تو ایک جوان لڑکی تھی۔آتے جاتے کبھی آنچل لہرا جاتی---کبھی کندھا چھو لیتی۔کبھی کوئی چیز پکڑاتے ہوئے انگارہ سی انگلیاں چھو دیتی۔

ہدایات ساری اماں بی کی تھیں۔ورنہ کوئی لڑکی یوں شادی شدہ مرد کے لئے اتنی

بے با کی سے جال نہیں بچھاتی۔

باسمہ جب گھر آئی تو تقدیر کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ اسے ہسپتال میں پندرہ دن رہنا پڑ گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اپنے شوہر سے پندرہ دن کے لئے جدا ہوئی تھی...... اسی لئے تو وہ انگلی پکڑ کر چلنے والا اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا تھا۔ سیانے ٹھیک کہتے ہیں۔ کبھی کبھی شوہر کو مکمل آزادی دے کر کھلا چھوڑ دینا چاہیے۔۔ کھلے جانور کو اسیر کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔۔۔ جن کے گلے میں ہمہ وقت ایک رسی ہو وہ جانور بہت جلد اسیر کر لئے جاتے ہیں۔

ادھر اباجی کا دم آنکھوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اب نکلا کہ تب نکلا۔ شاید ان کا دم نکل جانے سے اتنا دکھ نہ ہوتا۔۔۔ جتنا اپنے بھرم کے نکل جانے کا ہوا تھا۔

پندرہ دن؟ ان پندرہ دنوں میں پندرہ مختلف راستے سانپوں کی صورت میں ادھر ادھر سے نکل آئے تھے۔۔۔ اور وہ کھڑی تلاش کر رہی تھی کہ اس کا اپنا راستہ کون سا تھا۔

اماں بی نے ایک دن تاک کر چاند ماری کی اور نشانہ ٹھیک دائرے کے اندر چلا گیا۔

''ہنسی مٹکتی فہمیدہ اٹھ کر چلی گئی تو اپنے لہجے میں شیرینی سمو کر' ذرا قریب آ کے سر گوشی کے انداز میں بولیں۔

''میرے بچے آج کل تیرے چہرے پر میں ایک خوب صورت سی شگفتگی دیکھ رہی ہوں۔ بانجھ عورت کے ساتھ رہ رہ کر مرا بیٹا مرجھا گیا تھا۔'' (زندگی میں پہلی بار امان کو بانجھ کا لفظ باسمہ کے ساتھ لگا نا برا نہیں لگا' ورنہ تو وہ اس لفظ سے سیخ پا ہو جایا کرتا تھا)

''سچ ہے' دنیا میں سب سے بڑی خوشی اولاد کی خوشی ہے۔ مجھے امید ہے اللہ میرے بیٹے کو بہت سے بچے دے گا اور یہ گھر بچوں سے بھرا نظر آئے گا۔''

اس بار اماں چپ رہا تو بولتی گئیں۔

''ابھی تو تو خیر سے جوان ہے۔ اور لڑکی بھی گھر ہی میں ہے--- کتنی سلیقہ شعار' حلیم اور منکسر المزاج لڑکی ہے۔ دن رات تیری خدمت کرے گی' جہاں تو پاؤں رکھ دے وہاں اپنا سر رکھتی ہے۔ بھلا اس زمانے میں کوئی ایسی لڑکی ہے۔ جو سوتن والے گھر میں جانا چاہتی ہے---؟''

امان نے اس بات پر حیران ہو کر اماں بی کو دیکھا۔

''ہاں یہ بات تو بس ہماری فہمیدہ میں ہے--- باسمہ کے ساتھ مل جل کر رہنے پر تیار ہو گئی ہے...... اور میں کون سا کہہ رہی ہوں کہ تو باسمہ کو طلاق دے دے--- اس کو بے آسرا کر کے مجھے کتنا ثواب ملے گا--- نہ نہ--- اس بیچاری کا اس میں کیا قصور---؟ تو اس کو بھی اپنے ساتھ ساتھ رکھ--- اسی گھر میں--- تم اور باسمہ پہلے کی طرح اوپر والے حصے میں رہنا--- فہمیدہ میرے ساتھ رہے گی--- ایک دو بچے ہو جائیں تو ہم ماں بیٹی مطمئن ہو جائیں گے۔ تم ہماری خبر لو نہ لو--- ہمیں پرواہ نہ ہو گی--- ہاں--- میں تم دونوں کو جدا کرنے کا گنہ کیوں کروں۔ مجھے تو صرف تمہاری اولاد سے غرض ہے--- اور فہمیدہ بہت بڑی قربانی دینے کو تیار ہو گئی ہے--- ذرا سوچ کے بتاؤ آج کل کی لڑکیوں میں اتنی محبت ہے---؟ گھر کی لڑکی ہے۔ اس لئے تم اس کی قدر نہیں کر رہے۔

''اماں بی نے تو یہ مسئلہ خود ہی حل کر دیا ہے'--- امان نے دل میں سوچا۔ بڑا اچھا بندوبست ہے۔ ذرا سا ''دریافت'' کا چکر بھی پورا ہو جائے گا۔ اور باسمہ کا بھی ساتھ رہے گا۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

امان چپ رہا تو --- اماں بی سمجھ گئیں کہ لوہا گرم ہے --- جدھر چاہوں گی موڑ لوں گی --- اٹھ کر اپنی صندوقچی نکال لائیں- اور اپنی ایک پرانی، سنبھال کر رکھی ہوئی انگوٹھی نکال کے فہمیدہ کو پہنا دی --- اسی رات باسمہ گھر آ گئی-

فہمیدہ کی پراسرار مسکراہٹ اور سیدھے ہاتھ کی دوسری انگلی میں چمکتی ہوئی پرانے طرز کی انگوٹھی اسرار کے سب پردے اٹھانے لگی-

بہت ذہین تھی- نو سال سے زندگی کے نشیب و فراز دیکھ رہی تھی- لاشعوری طور پر ہمیشہ ایک خطرہ محسوس کیا کرتی تھی --- خطرے کی موجودگی سونگھ چکی تھی-

رات جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو کمرے کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا- صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں فہمیدہ کمرہ سنوارتی رہی ہے- یہ بات تعجب کی نہیں تھی- حیرت کی بات تو یہ تھی کہ امان نے یہ ساری تبدیلی پسند کر لی تھی- ہر شے اپنی جگہ سے ہلا دی تھی- حتیٰ کہ بستر کے تکیے بھی اپنی جگہ پر نہیں تھے-

باسمہ نے سر اٹھا کر امان کی طرف دیکھا --- آیا اس کا دل اپنی جگہ پر ہے یا نہیں- امان رک رک کر بولا --- ''دیکھو نا؟ باسمہ- نو سال سے میں مسلسل اماں بی کو ٹال رہا ہوں- آخر تو مجھے ان کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے- یہ بھی تو میرے فرائض میں سے ہے- اولاد کی ضرورت کسے نہیں ہوتی --- تم جانتی ہو میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں- تمہیں چھوڑ نہیں سکتا- تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا- اس کے بیچوں بیچ اگر کوئی حل نکل آئے تو تمہیں بھی اسے قبول کر لینا چاہئے-''

باسمہ چپ ہو گئی-

آئی تو تھی پھر سے سہاگ رات منانے، بہت دنوں کی جدائی نے اسے تڑپایا تھا- مگر اب جذبات کے برانگیختہ توے پر امان کی کج ادائی نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈال

دیئے تھے۔ سینے پر ہاتھ رکھا تو چپ کی سل کلیجے میں اتر گئی۔

باسمہ باسمہ۔۔۔

امان نے دو تین مرتبہ پکارا...... پھر اٹھ کر اس کے چہرے پر جھک گیا۔

''خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھو باسمہ۔۔۔ میں تمہیں ہرگز چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں تمہارے ساتھ آج بھی محبت کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ بچہ...... بچہ...... یہ ایک خلش کہیں خلیج نہ بن جائے۔''

''بچہ خلیج نہیں بنے گا امان اللہ خان!''

''مگر یہی بچہ ہمارے درمیان خلیج بنے گا۔''

''کتنا ستم ہے کہ جب میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں تم کہہ رہے ہو میں تمہیں غلط نہ سمجھوں۔ اوہ۔۔۔ اسی موڑ پر تو مرد بے نقاب ہوتا ہے۔''

''میں نے تو تمہیں اماں بی کی خواہش بتائی ہے۔ میں تمہاری اجازت کے بغیر شادی نہیں کروں گا۔ ہرگز نہیں...... یونہی تمہارے قدموں میں رہوں گا۔''

''جب کسی مرد کے دل میں دوسری شادی کا خیال آ جاتا ہے۔۔۔ وہ اسی لمحے شادی کا مرتکب ہو جاتا ہے...... خیانت ہو چکی۔۔۔ عملی کارروائی تو بالکل زمانہ سازی ہوتی ہے۔ میرے محبوب دل بدلتے ہیں تو لہجے بھی بدل جاتے ہیں...... اور وہ...... جو تم میرے نصیب کی راتیں چرا چرا کر اس پر نثار کرو گے۔۔۔! اور وہ جو مجھ پر چلائے ہوئے تیر اس پر آزماؤ گے۔۔۔ اور وہ مجھ پر برتے ہوئے فقرے اس کی جھولی میں ڈالو گے۔...... اور وہ جو ہر رات ایک اسٹیج پر دو ڈرامے کرو گے۔۔۔ کیا اس سے تمہارا دل مطمئن ہو گا؟

اور وہ جو ذرہ ذرہ کر کے تمہیں مجھ سے چرا لے گی۔

اور میں اپنے ذبح ہونے کا نظارہ ہر رات کس طرح دیکھا کروں گی--- دیکھو تو مرد کی محبت کی انتہا---عورت کے گلے پر چھری پھیر کر اس کی رضا مانگتا ہے- اس کا مزار بناتا ہے- پھر اس پر جشن چراغاں کرتا ہے......

''اس کی روح کھینچ لیتا ہے--- اور چاہتا ہے وہ مسکراتی رہے--- اور ظلم کو احسان کی چادر میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے-

کاش کبھی کوئی عورت کسی مرد کو اتنی بڑی تکلیف دے سکے......

اور صاف کہہ دے کہ میں تم سے سدا محبت کرتی رہوں گی--- مجھے دوسرے مرد کی بیوی بننے کی اجازت دے دو---تقسیم ہونے سے کیا الفت مٹ جائے گی---؟''

باسمہ کو مات مل چکی تھی---

آگے چلنے کو اس کے پاس کوئی مہرہ نہ تھا......

وہ برف کے تودے کی طرح پڑی رہی......نو سال کا ہر ہر لمحہ اس پر اذیت بن کر اترتا رہا...... اسے یوں محسوس ہوا جیسے گزشتہ نو سال کا ہر پل ڈیپ فریزر میں رکھا رکھا ٹھٹھر گیا ہے- اسی طرح اسی عالم میں منجمد ہوا پڑا ہے-

جب چلانے کا کوئی جواز نہ ہو مگر آدمی بے اختیار چیخنا چلانا چاہے--- اس وقت منہ پر کیسے ہاتھ رکھا جائے---؟

اس نے اپنی سن ہوتی ہوئی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسایا اور اٹھ کر ان ہاروں کی کلیاں مسلنے لگی- جو وہ آتے ہوئے بازار سے خرید لائی تھی- اس نے ملن کی رات کا ایک انداز بنا رکھا تھا--- رات جب بھی امان اپنے بیڈ روم میں داخل ہوتا--- اسے یوں احساس ہوتا جیسے آج ہی اس کی شادی ہوئی ہے- چھپر کھٹ کو نئے انداز سے سنوار کر پتی پتی سے سجانا اس کی پرانی ادا تھی--- آج بھی وہ ڈھیر سارے

گجرے، کلیاں اور پھول لے کر آئی تھی- بہت دیر بعد ملن رت آ رہی تھی......

پر یہ بیچ میں سرخ دھاری کیسے آ گئی---؟

اسی وقت بی اماں نے اچانک امان کو پکار کر بلا لیا اور وہ نیچے اتر گیا تو باسمہ کو سوچنے کا موقع مل گیا-

اس نے اپنی ساری ہمت اور ذہانت مجتمع کی اور اپنے آپ سے بہت سے سوالات کئے-

ہر بار اس کے دل نے یہی جواب دیا---سب کچھ اپنے ہاتھ سے کر دے- آج یہ شادی رکوا لے گی، کل کیا کرے گی؟ جو گھٹا امنڈ گھمنڈ کے چھائی ہے--کسی نہ کسی رت میں چھاجوں برسے گی---کیا بی اماں باز آ جائیں گی---یا امان کے دل کی گرہ کھل جائے گی---مرد لڑکھڑایا ہے تو گرے گا ضرور---بی اماں محتاط شکاری تھیں---فہمیدہ کو اس کے سرہانے لا بٹھایا تھا......سرہانے کی طرف آگ ہو تو سینک پہلے چہرے کو پہنچتا ہے---اور وہ ہاتھوں میں پھول لئے اس آگ کو بجھانے کا تہیہ کئے کھڑی تھی- پھول آگ کو بجھاتے نہیں---ہاں انہیں اس آگ کو معطر کر دینا چاہیے-

لیکن کیا تقسیم شدہ مرد مخلص رہ سکتا ہے؟

اور کیا کوئی مرد دونوں بیویوں کا حق برابر ادا کر سکا ہے- آج تک سنا تو نہیں؟

دیکھ بھی لیں گے-

اماں نے اوپر بھیجنے سے پہلے امان کو اچھی طرح پڑھایا تھا اور جب وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا تو کہیں سے فہمیدہ نے نکل کر ہاتھ ماتھے پر لیجا کر سلام بھی کر دیا تھا- اس ہاتھ میں منگنی کی انگوٹھی جھلمل کر رہی تھی اور وہ ہاتھ امان کو ایک انگارہ سا لگا تھا اس یاددہانی پر امان لرز سا گیا......دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے لگا- ایک عورت کنارے کے اس پار کھڑی تھی اس کا سراپا ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا مگر اشارے سے اسے بلا رہی تھی مرد کو اشارہ ہی تو تباہ کر دیتا ہے-

ایک مبہم سے اشارے پر وہ اپنی زندگی کا دھارا ہی بدل دیتا ہے--- دوسری

عورت اس کے پہلو میں کھڑی تھی - اس کا دل گر مارہی تھی - مزاج داں تھی --- محبوب تھی - چراغ کی طرح اسے ہتھیلیوں پر اٹھائے چلی آرہی تھی - مگر ---

مرد کو پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت کبھی نظر نہیں آئی' اسے لئے وہ ہمیشہ سامنے دیکھتا ہے - قریب نہیں دیکھ سکتا -

ذہن اس کا کمرے میں بھٹک رہا تھا - دل وہاں ایک مبہم سے اشارے میں اٹک گیا تھا -

☆

ایک رات زندگی کی ان گنت راتوں میں سے نکال کر' باسمہ نے اپنے نصیب کی چادر پر سجالی - اس ایک رات کو وہ محبت کے زور پر جیت لینا چاہتی تھی - بھلا مرد کا ایمان بدلتے کون سی دیر لگتی ہے - باسمہ نے اپنا شب خوابی کا بہترین لباس پہنا --- بالوں میں موتیا کی سفید کلیاں گوندھیں اور گلاب کی پتیوں سے تکیوں پر امان' امان لکھ دیا --- یوں وہ اکثر کیا کرتی تھی - امان جب کمرے میں آتا تو سفید بستر پر گلاب کی پتیوں سے جا بجا اس کا نام لکھا ہوتا - اور اسے پاگل کر دینے کو یہی کافی ہوتا --- آج تو جنوں سامانی کے لئے اس نے سارے محاذ کھول دیئے تھے - سارے کمرے میں سہاگ رات التجا بن کر اتر آئی تھی' باسمہ دھیمے دھیمے سروں میں گنگنا رہی تھی -

آج ہے پیار کا فیصلہ او صنم ......

امان کمرے میں آیا تو مبہوت ہو گیا ---

باسمہ تھی یا قیامت --- شعلہ بداماں سی - ویسی ہی پراسرار - کلیوں میں گوندھی چاندنی کی طرح -

''باسو! مجھے بچالو -''

اس نے باسمہ کے بازوؤں میں چھپتے ہوئے کہا -

یہی کچھ باسمہ سننا چاہتی تھی......اپنی دعاؤں کا اثر دیکھنا چاہتی تھی۔

''باس--- باس--- وہ اسے چلا چلا کر پکارنے لگا--- یونہی باسمہ اسے بے خود کیا کرتی تھی اور جانتی تھی--- جب شہزادہ جال میں پھنسے تو پھر کون سا منتر پھونکنا چاہیے۔ پر آج نہ جانے کیا ہوا۔ ہونٹوں سے نغمے پھوٹنے کے بجائے آنکھوں سے جھرنے پھوٹ پڑے۔

باسمہ نے پہلے تو اس کے چہرے کو آنسوؤں سے غسل دیا اور پھر محبت کی انتہا کر دی--- یہی ایک رات تو مانگی تھی اس نے امان سے---

جب امان بے اختیار کہہ اٹھا۔

''بدنصیب ہے باسمہ وہ مرد جو تمہیں بھول جائے۔''

''امان---

''باسمہ! تم میری جنت ہو۔ اور جنت کوئی منتشر نہیں کرنا چاہتا۔''

''لعنت بھیجوں بچوں پر--- مجھے تمہارے علاوہ کچھ نہیں چاہیے باسمہ

''امان! تم اماں سے بھی وعدہ کر چکے ہو۔''

''وعدہ توڑا بھی تو جا سکتا ہے نا؟''

''ہاں مگر یہ زہر کا پیالہ بن جائے گا۔

''مگر میں کیا کروں؟ کیا کروں باسمہ؟ اس نے باسمہ کے لمبے بالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کھینچا۔ میں اپنے آپ کو کیسے تقسیم کروں؟

''ہاں۔ یہ سوچنے کی بات ہے امان--- منقسم مرد کسی عورت کی امانت نہیں ہوتا بعض اوقات مرد کو تقسیم کیا جائے تو مر جاتا ہے--- کیا تم میرے بغیر جی سکو گے امان---

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' امان نے نشے میں لدی لدی آواز میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے تم میرے بغیر جی نہیں سکتے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' امان نے اس کے بالوں میں منہ چھپا لیا---''اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے۔''

''صبح ہو گی نا---؟'' وہ آنکھیں موندے موندے بولا---''تو میں اماں بی سے صاف کہہ دوں گا۔''

''ہاں صبح ہو گی جب نا۔'' باسمہ نے افسردگی سے کہا۔''آج رات بچیں گے۔ تو سحر دیکھیں گے۔ تم دیکھ لینا۔

''کیا کہہ دو گے بی اماں سے؟'' باسمہ نے بہت سی پتیاں اٹھا کر اس کی پیشانی پر سجا دیں۔

''میں کہہ دوں گا مجھے بچے کی ضرورت نہیں۔ میرا سب کچھ باسمہ ہے۔''

''وہ تو تم نو سال سے کہتے آ رہے ہو۔''

''نو سال تک اور کہتا رہوں گا۔''

''امان۔ میں تم پر نو صدیاں اور نثار ہوتی رہوں گی۔''

''باسمہ...... باسمہ...... باسمہ''......

صبح جب وہ دونوں رات کی مرجھائی ہوئی پتیوں سے کھیل رہے۔......تو بی اماں تاریخ مقرر کرنے کے لڈو لے کر اوپر آ گئیں......

باسمہ نے امان کی طرف دیکھا---امان کے ہونٹوں کو تالا لگ گیا۔

کیا ان لڈوؤں میں کوئی طلسماتی طاقت تھی۔ باسمہ نے گزری رات کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

اور اپنے آنسو چھپانے غسل خانے میں چلی گئی۔

مرد کی صبح اور رات میں بہت فرق ہوتا ہے۔

.... ☆ ....

نیچے بی اماں کے ساتھ والا کمرہ سجاتے ہوئے باسمہ سوچ رہی تھی۔

''کیا یہ سب کرنا بھی محبت میں رقم تھا'' --- جب تقدیر اس کے خلاف ہو گئی تو اس نے سوچا یہ سب اپنے ہاتھوں سے کر دے۔ مرد طوطا چشم بن جائے تو عورت کو چشم پوشی کرنی چاہیے۔ یہ امید کیا کم تھی کہ وہ اب بھی امان کی تھی۔ اور امان نے سدا اسے اپنے قریب رکھنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ قدرت کی بعض ستم ظریفیوں کے ساتھ سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے شوہر کی شادی اپنے ہاتھ سے کرنا اور پھر اپنی سوتن کا چھپر کھٹ سجانا بڑے دل گردے کا کام ہے......

یوں کبھی کسی نے گرم سیخوں پر اپنا دل چڑھا کے اس کے کباب بنائے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا ہے۔ محبت کے نام پر --- یا مجبوری کے نام پر۔

وہ فہمیدہ کا چھپر کھٹ نہیں سجا رہی تھی' بلکہ اپنے مزار پر پھول چڑھا رہی تھی۔

اس وقت گلے میں لمبا سا ہار پہنے امان سامنے نمودار ہوا۔

اس نے جن نظروں سے باسمہ کو دیکھا باسمہ لرز گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کا دل چاہا۔ یہ جو انسانیت کا مصنوعی لبادہ اس نے اوڑھ رکھا ہے' اسے چاک کر دے ہر فرض سے منہ موڑ لے' باغی ہو جائے۔ اور امان کو اپنے دونوں بازوؤں میں چھپا کر یہاں سے کہیں فرار ہو جائے۔ اس میں اور امان میں ابھی صرف دو قدم کا فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ بڑھتے بڑھتے سانپ بن جانے والا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھول اسے بچھوؤں کی صورت ڈسنے لگے۔

کل رات آخری رات تھی جو امان نے اس کے زانو پر سر رکھ کر بتا دی تھی- ساری شب وہ امان کے چہرے پر اپنی زلفیں پھیرتی رہی تھی اور امان مسلسل قسمیں کھاتا رہا تھا' ثابت قدمی کی' وفا کی--- واہ' وہ ہر بار ہنس پڑتی-

کیسے عیسیٰ ہو کہ بیمار کئے دیتے ہو"

کل شب بڑی تاریک بڑی پرسوز تھی--- جب بھی بے تاب ہو کر امان قسم کھاتا' ستارے شرارت سے آنکھیں مارتے...... ستاروں کی اس شرارت آمیز بدشگونی پر وہ دل مسوس کر رہ جاتی-

اور آج وہ نیند کی گولیاں خرید لائی تھی- یوں رات اس لئے تو نہیں آتی کہ ضرور سونا چاہئے- مگر کبھی کبھی تو رات کے بغیر بھی سو جانے کو جی چاہتا ہے--- ایک لمبی نیند--- اور آج امان اسے کیسی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا--- ان نظروں میں بے بسی تھی--- یا فریب کے چاک ہو جانے کا ڈر--- اس کا شکی دل ہر ایک سے بدگمان ہو رہا تھا-

باسمہ نے اپنی آنکھوں کے آنسو چھپانے کے لئے یوں نظریں پھیر لیں جس طرح ہرجائی مرد نئی عورت کی آمد پر پھیرتا ہے- ان مہکی کلیوں کو اپنے آنسوؤں کی شبنم سے بھگوتی وہ اوٹ میں ہوئی جا رہی تھی کہ بی اماں لال جوڑا پہنے نمودار ہوئیں--- بارات جانے کی جلدی تھی اور بی اماں باسمہ کو بارات کے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں- ان کو ڈر تھا کہ اگر اس کو گھر میں چھوڑ گئے--- تو شاید عروس نو کے چھپر کھٹ پر وہ کوئی نامرادی کا ٹونا ٹوٹکا کر دے گی--- بھلا نامردوں کے پاس گھر جلانے کے لئے تعویز کہاں سے آئیں گے؟

وہ بارات کے ساتھ جانا نہ چاہتی تھی- مگر جانا پڑا- یوں جیسے کوئی اپنے ہی جنازے

کے ساتھ چل رہا ہو۔

لوگ ہمدردی نہیں کرتے۔ ہمدردی کے بہانے زبان کا چھرا گھونپ کے تڑپنے کا تماشا دیکھتے ہیں۔ اسی لئے تو ایسے موقعوں پر الٹے سیدھے سوال کرنے سے باز نہیں آتے۔

"یہ ہے پہلی بیوی---

"ہائے کتنی خوبصورت ہے؟"

"اف اللہ اتنی سندر مورت کے ہوتے ہوئے دوسری شادی رچا رہا ہے۔"

"نصیب کی بات ہے۔"

"سچ کہا ہے کسی نے 'سہاگن وہی جسے پیا چاہے'"......

"بچہ نہیں ہے بیچاری کا! چہ چہ"......

"ہائے ہائے بدنصیب بچاری۔ اس خوبصورت جوانی کا کیا فائدہ---؟ اللہ کے کام بھی نیارے ہوتے ہیں۔"

"واہ میرے مولا تیرے صدقے۔"

"ویسے ہے دل گردے والی--- خاوند کی بارات لے کر آئی ہے۔ اور کس کس طرح ہنس ہنس کے ہر ایک کو بری دکھا رہی ہے۔"

(کاش اپنا دل دکھا سکتی)

"فہمیدہ تو اس کے پاؤں کی جوتی بھی نہیں۔"

"مگر جب اس کے بچے ہو جائیں گے تو اس پر بھی راج کریں گی۔"

یوں ایسی باتیں سن کر مسلسل مسکرائے جانا بھی حوصلے کی بات ہے لوگ تو بار بار مسکراہٹ کا پردہ چاک کرنا چاہتے ہیں--- لوگ تو چاہتے ہیں دل میں نشتر چبھو کے

بوند بوند لہو ٹپکنے کا نظارہ بھی اپنی آنکھوں سے کر لیں- لیکن لدے ہوئے بادل کم ظرف نہیں ہوتے- زمین دیکھ کر برستے ہیں---

مسکراتے مسکراتے اس کے جبڑے دکھنے لگے--- اور جبر کرتے کرتے اس کا دل پھوڑا بن گیا- تب کہیں برات گھر آئی-

پھر وہ نیچے نہیں رک سکی- دوڑ کر اوپر آ گئی-

اوپر کمرے میں رات اندھیری تھی اور امید کا کوئی ستارہ بھی خالی آسمان پر نظر نہیں آ رہا تھا-

سیج کی اوٹ میں جو ڈرامہ ہوتا ہے' وہ اسے بھول جانا چاہتی تھی- اور مرد کے اس روپ کو بھی--- جانے کیسے کیسے پل پل بیٹھی اندھے کنوائیں میں پھنک رہی تھی کہ ایک شور سا اٹھا- پھر دھڑ سے دروازہ کھلا' اور امان اندر آ گیا-

ایک ثانیے کے لئے اس کی دھڑکنیں رک گئیں--- اگر دل کے رشتوں کی مضبوطی کا یہ عالم ہے کہ امان خوبصورت لمحات کی زنجیر توڑ کر پرانی صحبتوں کی آغوش میں چلا آیا ہے- تو آج شب کے بعد وہ زندہ نہ رہے گی--- اور اس خوشی کی قیمت اپنی زندگی دے کر چکائے گی- اور امان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسا انعام دے جائے گی کہ وہ تر و تازہ پھول کی طرح اسے یاد رکھے گا-

مگر امان تو بڑا ہراساں دکھائی دے رہا تھا- اس کے سر اور کندھوں پر جو پھول لٹک رہے تھے...... وہ لرز بھی رہے تھے- گریبان کے بٹن کھلے تھے--- آنکھیں چڑھی چڑھی تھیں--- جیسے کسی دشمن نے پلائی ہو--- سانس بے ترتیب تھی--- اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے- وہ ڈرتی کانپتی کھڑی ہو گئی-

پیچھے ہی اماں بی اور چند عورتیں بھی کمرے میں داخل ہوئیں-

خداوندا!

کیا کوئی اور قیامت بھی آئے گی؟

اب کونسا کھیل دھرتی پر رچایا جائے گا؟

وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''بیٹا بولو نا؟'' بی اماں کی آواز آئی۔

تو وہ اپنی بھاری' لرزاں لرزاں آواز میں بولا۔

''باسمہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔''

''نہیں امان نہیں --- اپنے الفاظ واپس لو --- تم میرے بغیر جی نہ سکو گے۔ میں تمہارے بغیر''......

''باسمہ' میں تمہیں ان سب لوگوں کی موجودگی میں طلاق دیتا ہوں۔''

''باسمہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔''

تین ہی بار بمباری کرنا تھی اسے ---

اماں بی بازو سے پکڑ کر اسے باہر لے گئیں۔ یہ بہادری کا کارنامہ کرنے کے بعد وہ بھی نڈھال نظر آ رہا تھا۔

باسمہ کی چیخیں اس کی اپنی حالت زار پر ہنسنے لگیں۔

یہ آخری ہدایت بھی' فہمیدہ کو اماں کی طرف سے تھی --- ''کہ جونہی اسے سرشار کر لو --- ہوش اور بے ہوشی کے کنارے پر لے آؤ --- تو ایک قدم آگے بڑھنے سے پہلے طلاق کا مطالبہ کر دینا۔ دیکھو طلاق دلوائے بغیر اسے اپنا شوہر نہ بننے دینا۔ چاہے اس کے لئے کتنی ہی راتیں غارت کرنا پڑیں۔ ورنہ --- اس کے بعد تم بازی جیتنے والا سب سے بڑا پتہ ضائع کر دو گی۔''

''امان---امان---''

باسمہ سسک نہیں رہی تھی...... رو نہیں رہی تھی...... اس کی یہ بے ترتیب سانس امان' امان کا ورد کر رہی تھی---اور کہہ رہی تھی---

یک بیک ترک تعلق میں بھی رسوائی ہے
الجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

جب تک ہوش رہا--- یہی کہتی رہی--- نیند کی گولیاں کھانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی--- ایک بار جو بے ہوش ہوئی تو پھر دن کی دھوپ نے ہی اسے ہوش دلایا۔

اور اماں بی نے بھی نئے دولہا دلہن کے اٹھنے سے پہلے پہلے اسے میکے پہنچا دیا--- سامان بھی پہنچ گیا--- شام تک وہ حصہ' وہ چھپر کھٹ نئی دلہن کے لئے سجا دیا گیا تھا۔

یہ سب کتنا ناممکن سا لگتا ہے۔ مگر جب--- موت اور زندگی میں صرف ایک سانس کا فاصلہ ہے--- اور پل بھر میں یہ فاصلہ پاٹ دیا جاتا ہے--- آنکھیں موندتے ہی دوسرا جہاں آ جاتا ہے تو وہ کس طرح ایک دن میں اپنا طویل سفر نہیں طے کر سکتی---؟

............☆............

اس وقت امان ایک جنرل اسٹور کے باہر کھڑا اپنے دوست کے ساتھ گپ شپ لگا رہا تھا--- اب وقت بے وقت فضول گوئی کرنا' دفتر سے اٹھ کر آوارگی کرنا' جدھر چاہنا منہ اٹھا کر چل دینا اس کی عادت بن چکی تھی۔ زندگی کا کوئی رویہ رہا تھا نہ اصول۔

جونہی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا--- سامنے موٹر میں باسمہ جا رہی تھی۔ جانے کیوں اب بھی' جب وہ باسمہ کو دیکھ لیتا کوئی جیسے اس کے دل میں ایک چٹکی لیتا--- دو

چار سال تو --- اسے باسمہ کہیں نظر ہی نہ آئی تھی - ویسے اس نے سن لیا تھا کہ اس نے کسی امیر آدمی سے شادی کر لی ہے - اس نے اپنی کینچلی بدل لی ہے اور بڑی خوش و خرم رہتی ہے - جانے اسے باسمہ کی شادی کی خبر نے دکھ کیوں پہنچایا تھا --- کیا وہ چاہتا تھا ساری عمر باسمہ بھکاریوں کی طرح نادار ہی زندگی گزار دیتی ---؟

مگر کس برتے پر ---؟

پھر ایسا ہونے لگا کہ شہر کے کسی چوراہے پر' کسی ریستوران میں' کسی مارکیٹ میں اسے باسمہ نظر آ ہی جاتی - اپنے نئے شوہر کے ساتھ' کسی نئی سہیلی کے ساتھ' کبھی تنہا اپنی نئی کار میں --- اس کے تن پر دیدہ زیب لباس ہوتا اور چہرے پر اتنا اطمینان ہوتا کہ امان کا دل جل کر کباب ہو جاتا --- ایسا اطمینان اور ایسا سکھ تو امان کے نصیب میں نہیں آیا تھا --- حالانکہ وہ بامراد تھا - اور باسمہ کی کوکھ ابھی تک خالی تھی - جب بھی وہ باسمہ کو اس عالم میں دیکھ لیتا' اس کا دل چاہتا --- وہ جا کر سرِ راہ باسمہ کو پکڑ لے --- اسے کوئی کچوکا لگائے --- اسے بے وفائی' کج ادائی کا طعنہ دے --- کوئی ایسی بات کہے کہ ہنستی ہوئی باسمہ رو پڑے......

آج بھی جب باسمہ بڑے وقار سے موٹر چلاتی ہوئی اس کے آگے سے گزر گئی - تو بے اختیار اس کا دل چاہا وہ اس کا پیچھا کرے - بالکل اس طرح جس طرح جوانی کے اولین دنوں میں وہ اس کا پیچھا کیا کرتا تھا - باسمہ ان دنوں کالج کے آخری سال میں تھی - اور امان یونیوسٹی کے آخری سال میں تھا - دوسرے نوجوان لڑکوں کی طرح وہ بھی چھٹی کے وقت زنانہ کالج کے گیٹ کے باہر کھڑا ہو جاتا تھا - پھر ایک دن اس کی نظر باسمہ کے لمبے بالوں میں الجھ کر اس کی خوبصورت گہری براؤن آنکھوں میں ٹھہر گئی -

اس دن کے بعد سے وہ صرف باسمہ کا انتظار کیا کرتا تھا - اس کا پیچھا کرتا تھا - اس

بس اسٹاپ تک جاتا جہاں سے باسمہ گھر کے لئے سوار ہوتی تھی۔ یوں اس کی رسائی باسمہ کے گھر تک ہوئی۔ پیچھا کرنے کا یہ عمل پانچ سال تک جاری رہا...... حتیٰ کہ باسمہ کے دل میں وہ چنگاری پھوٹ نکلی جو آتش عشق کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ تب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا اور باسمہ دل کے جذبوں پر ایمان لے آئی تھی۔

مگر کسی لڑکی کا پیچھا کرنے میں کس قدر مزہ آتا ہے اسے اب تک یاد تھا۔ گو وہ اب نوجوان قسم کا جوشیلا عاشق نہیں تھا مگر باسمہ ابھی تک اتنی ہی خوبصورت تھی کہ کوئی مرد اسے دیکھے تو اس کا پیچھا کرنے پر مجبور ہو جائے۔

وہ بے کلی میں ٹہلتا ٹہلتا سڑک پر دور تک نکل آیا اور مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سڑک کے پار، بڑے چوراہے کی بغل میں اس کی نظر ٹھٹھک گئی۔ بینک کی لیڈیز برانچ کے باہر باسمہ کی پیلے رنگ کی مزدا کھڑی تھی۔ غالباً وہ بینک کے اندر گئی تھی۔

جنرل اسٹور کا مالک امان کا دوست تھا۔ امان اس کے پاس گیا اور بولا۔

''یار میری موٹر باہر کھڑی ہے۔ دھیان رکھنا۔ میں ذرا سڑک کے پار بینک تک جا رہا ہوں۔''

وہ سڑک پار کر کے بینک تک چلا گیا --- گو بینک تک کہکشاں راستہ نہیں بنا رہی تھی۔ مگر جانے اسے ان راہوں پر جانا اچھا کیوں لگا ---؟

پھر وہ موٹر کے قریب چلا گیا۔ اور بے اختیار جھانک کر اندر کی طرف دیکھنے لگا۔ موٹر کی پچھلی سیٹ پر بلوچی کام کی دو گدیاں پڑی تھیں۔ ونڈ اسکرین کے آگے' ایک خوبصورت سنہرے بالوں والی گڑیا لٹک رہی تھی۔ آگے انگریزی کے دو تین ناول پڑے تھے ایک ڈبہ ٹشو پیپرز کا اور ایک ائیر فریشنر کی بوتل بھی نظر آ رہی تھی۔ باسمہ خوشبو کی دیوانی تھی۔ اس لئے موٹر میں بیٹھتے ہی چاروں طرف خوشبو چھڑک لیا کرتی تھی۔ اور بار

بارٹشو پیپر سے پسینہ صاف کیا کرتی تھی- اس کی آج بھی وہی عادت تھی...... اجلی اجلی...... مہکی مہکی......

پھر ایک اندرونی ابال اور تجسس کے مارے وہ موٹر کے نزدیک چلا گیا- موٹر کی سطح پر ہاتھ پھیر کر دیکھا--- جیسے کہ باسمہ کے بدن کو چھو رہا ہو--- پھسلتے پھسلتے ہاتھ دروازے کی کنڈی کو جالگا--- دروازہ کھٹ سے کھل گیا--- وہ ڈر گیا-

پھر مسکرایا--- یہ عورتیں کتنی بھی ہوشیار بننے کی کوشش کیوں نہ کریں--- عورتیں ہی رہتی ہیں- بھلا اس طرح ایک چالو سڑک پر گاڑی لاک کئے بغیر چھوڑ جانا کہاں کی انسانیت ہے کوئی مرد یہ غلطی نہیں کرسکتا کہ وہ جانتا ہے کہ کوئی ''کس حد تک کمینہ ہوسکتا ہے-''

اپنے اس فقرے پر وہ خود ہی چونک بھی گیا اور گھبرا کر دروازہ پورا کھول دیا- اور بالکل غیر ارادی طور پر موٹر کے اندر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا- اندر سے چھڑ کی خوشبو کے علاوہ باسمہ کی مخصوص خوشبو بھی آرہی تھی-

عین اسی وقت باسمہ بینک کے اندر سے نکلی اور پرس جھلاتی ہوئی اپنی موٹر کی طرف بڑھی--- امان سیٹ پر بیٹھا بیٹھا منجمد ہوگیا- وہ اپنی موٹر کی طرف بڑھتی بڑھتی رک گئی- اور پھر چاروں طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اپنا مغالطہ دور کرنا چاہتی ہو- اگر یہ موٹر جس میں کوئی اجنبی بیٹھا تھا' کسی اور کی تھی' تو اس کی اپنی موٹر کہاں تھی---؟''

پھر جھک کر اس نے نمبر پلیٹ کو دیکھا--- اور جھنجلاتی ہوئی اپنی موٹر کی طرف بڑھی کسی اجنبی کی دیدہ دلیری پر اس کا خون کھول اٹھا--- نہ جانے کون احمق انسان تھا-؟ اس کی پریشانی بھانپ کر امان نے سر باہر نکالا اور معذرت کے سے انداز میں بولا-

''یہی آپ کی موٹر ہے؟''

باسمہ نے چابی کو مٹھی میں گھمایا اور اسے گھورتی ہوئی آگے بڑھی۔ جھٹکے سے دروازہ کھول کر' تنی تنی سی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی کہ شاید کوئی منچلے صاحب خواہ مخواہ لفٹ لینا چاہتے ہیں۔ اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس کا مزاج درست کرنا ضروری تھا۔ سر اٹھا کر غور سے دیکھا تو اس کی پیشانی کے بل لرز کر رہ گئے۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا--- چابی اسٹارٹ تک جانہ پائی--- اب منجمد ہونے کی اس کی باری تھی۔

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح امان سے ملاقات ہو جائے گی--- اتنے ڈرامائی انداز میں--- امان کی اس بے تکلفی پر اسے حیرت ہوئی--- اور موٹر کھلی چھوڑ کر جانے پر افسوس ہوا--- کچھ لمحوں تک وہ بالکل بولنے کے قابل نہ ہو سکی۔

تھوڑی دیر بعد امان رک رک کر بولا۔

''اس طرح موٹر کھلی چھوڑ کر نہیں جاتے-- کوئی بھی ناخوشگوار حادثہ ہو سکتا ہے۔''

باسمہ نے کار اسٹارٹ کر دی۔ اب وہ حواسوں میں آ چکی تھی۔ بڑے نپے تلے لہجے میں بولی۔

''یہ بھی...... ایک ناخوشگوار حادثہ ہے---

امان آیا تو تھا باسمہ کو کچوکے لگانے' دل کی آگ بجھانے--- مگر اس کے قریب بیٹھتے ہی موم کی طرح پگھلنے لگا۔ الفاظ پگھل پگھل کر اس کی گویائی کو سلب کرنے لگے تو باسمہ پھر بولی۔

''مہربانی کر کے آپ اتر جائیں۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ نہیں اتروں گا تو پھر تمہارا ردعمل کیا ہوگا۔؟''

باسمہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ اور بولی۔

''مجھے یقین ہے آپ ضرور اتر جائیں گے- کیونکہ آپ جانتے ہیں آپ کو اس موٹر میں بیٹھنے کا حق نہیں ہے- اس کے لہجے میں اعتماد اور زہر دونوں تھے-

امان لرز گیا--- اسے یوں لگا--- آج پہلی بار وہ نصیب کی بلندیوں سے گرا ہے-

روتے ہوئے لہجے میں ٹوٹ کر بولا-

''چند باتیں کرنے کی اجازت دو باسمہ- پھر میں خود ہی اتر جاؤں گا-''

''کچھ عرصہ ہوا مجھے ڈرامائی انداز سے بالکل نفرت ہو گئی ہے-'' باسمہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی چلادی- میں نہیں جانتی کون سی باتیں رہ گئی ہیں- جو آپ کو پانچ چھ سال کے بعد یاد آ گئی ہیں اور اگر ہیں تو آپ کو قانون کی رو سے میرے وکیل کے ساتھ رابطہ پیدا کرنا چاہئے تھا-

''بالکل امیر عورتوں کی طرح گفتگو کر رہی ہو- تمہارا تو لب ولہجہ ہی بدل گیا ہے-'' امان نے بڑے یتیم سے انداز میں کہا-

''کسی کا دل بدلتا ہے' کسی کا لہجہ بدل جاتا ہے- دنیا کی ہر شے بدل جانے پر قادر ہے-''

یکا یک امان کے لہجے میں روٹھا ہوا' ٹوٹا ہوا بچہ آن بیٹھا---

''ایسے لگتا ہے جیسے تم اپنی موجودہ زندگی سے بہت خوش ہو- تم بہت مطمئن نظر آ رہی ہو- کیا تمہارا شوہر بہت اچھا ہے--- بہت پیار کرتا ہے تم سے؟''

(الو کے پٹھے- یہ کیا کہہ رہے ہو--- امان نے اپنے کان خود کھینچے--- تم اس عورت کو تکلیف پہنچانے آئے تھے اور گھگھیا کیوں رہے ہو؟ ذلیل لگ رہے ہو)

''جی' میرا شوہر بہت اچھا ہے اور مجھ سے بہت پیار کرتا ہے--- اور اسے بچے کی

آرزو بھی نہیں ---

اب کے برچھی باسمہ نے پھینکی تھی۔

اوراس کے سارے تیر خطا ہو گئے تھے۔

وہ جھوٹ نہ بول سکا --- کوئی بات نہ بنا سکا --- مجبور چور کی طرح، اپنے دل کا ہر راز اگلنے لگا۔

''باسمہ! مجھے دیکھو۔ میں خوش نہیں ہوں۔'' باسمہ نے پلٹ کراس کی طرف دیکھا وہ واقعی خوش نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا تو حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ نہ چہرے پر شگفتگی تھی، نہ شادابی۔ آنکھوں کے گرداور تھوڑی کے نیچے بے شمار لائنیں پڑ گئی تھیں --- آدھے بال سفید ہو گئے تھے۔ جسم موٹا اور بھدا لگ رہا تھا --- کوٹ میں سے توند باہر نکلی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ بے ڈھب اور ناخن پیلے تھے -- جس طرح پرانے گھر کا فرش ہر جگہ سے اکھڑا ہوا ہوتا ہے --- اسی طرح امان کی شخصیت پر ادھڑ جانے کے نشانات تھے۔ تبھی تو اس ادھیڑ عمر آدمی کو باسمہ دور سے نہیں پہچان سکی تھی۔ اس کی بڑی دلکش شخصیت تھی اور من موہنی صورت تھی۔ بانکا چھبیلا تھا۔ خوش مذاق اور خوش مزاج تھا --- صبح کو خوشبوؤں میں نہا کر جاتا تھا۔ باسمہ نے اسے ایسے رکھا ہوا تھا جیسے ماں اکلوتے بیٹے کو بنا سنوار کے رکھتی ہے --- اب تو وہ کسی غریب گھر کا گیارہواں بچہ لگ رہا تھا --- ذرا چربی چڑھتی تو باسمہ اس کے لئے پرہیزی کھانا بنانے لگتی --- ذرا جسم ڈھیلا ہوتا تو وہ اس سے صبح کو ایکسرسائز کرواتی --- ذرا حلقے نمایاں ہونے لگتے تو رات کو اسے دودھ جلیبیاں کھلاتی اور صبح کو گلاب کے عرق سے منہ دھلاتی --- جس طرح کوئی موتیا کا نازک پودا اپنے کچے صحن میں لگا لیتا ہے اور پھر اسے ہاتھ کی اوٹ دے دے کر سینچتا ہے --- اس طرح باسمہ اسے سینچ رہی تھی۔ جس طرح تند ہواؤں میں کوئی بیراگن اپنا

چراغ اوڑھنی کی اوٹ میں کر لیتی ہے' اسی طرح باسمہ نے اسے حالات کی گرمی سے بچایا ہوا تھا۔

اف کس قدر بدصورت اور تباہ حال لگ رہا تھا۔ یہ آدمی جیسے باسمہ جیسی شہزادی کا ملازم ہو۔

''باسمہ وہ شرمندہ سے لب و لہجے میں بولا۔

''یہ تو ٹھیک ہے کہ بچے اس دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہیں اور کسی انسان کی خوشیوں کی معراج ہیں۔ جب تم میرے ساتھ رہتی تھیں تو کبھی کبھی بچے کی خلش مجھے بھی تڑپایا کرتی تھی۔ مگر محض تمہاری خوشنودی کی خاطر میں اس حقیقت سے آنکھیں پھیر لیا کرتا تھا۔ جب بی اماں نے میرا گھیراؤ کر لیا اور میرے اردگرد فہمیدہ کا دائرہ تنگ کرنے لگیں تو میری خفتہ خواہش بھی جاگ اٹھی --- ایک جوان عورت کا قرب اور ایک بچے کی آرزو دونوں نے مل کر میری آنکھیں بند کر دیں۔ میں نے اپنے ذہن کی آواز سننے سے انکار کر دیا اور دل کے اشاروں پر چلنے لگا --- مرد کی سوچ دور تک نہیں جا سکتی۔ اسے صرف آج نظر آتا ہے --- عورت کی طرح کل اس کا خزانہ نہیں ہوتا۔ کہ وہ اسے سنبھال کر رکھ لے۔ میں وہ...... نااہل بازیگر تھا۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی خواہشات کو اپنی انگلیوں پر نچاتا رہے گا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ چپ ہو گیا...... جب باسمہ کچھ نہیں بولی تو پھر شروع ہو گیا۔ شاید تم جانتی ہو گی کہ اب میرے چار بچے ہیں اور پانچواں پیدا ہونے والا ہے --- میں نے دنیا کی سب سے بڑی خوشی دیکھ لی ہے --- پھر میں کیوں ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں --- اجڑ گیا ہوں ---؟ منزل پر پہنچنے کی بجائے بھٹک کیوں رہا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں --- فہمیدہ جتنی بدصورت لڑکی ہے اتنی ہی بدمزاج بھی ہے۔ ہر بچے کی آمد اس کی تنک مزاجی میں اضافہ کرتی جاتی ہے۔ وہ سمجھتی

ہے بچے پیدا کر کے اس نے مجھے خرید لیا ہے۔ اسے اپنی ذات کے سوا کسی کا خیال نہیں ہوتا --- وہ انتہائی بد اخلاق پھوہڑ اور بد سلیقہ لڑکی ہے۔ وہی گھر جو تمہاری موجودگی میں جنت کا ٹکڑا لگتا تھا --- اب گندگی کا نمونہ لگتا ہے۔ مجھے چاندنی کے سائے میں رہنے کی عادت تھی۔ مجھے تم نے کہکشاں پر لٹایا تھا۔ مجھے تم نے ذہنی وجسمانی آسودگی کا امرت پلایا تھا ---

تم نے میرے اتنے ناز اٹھائے تھے کہ میں شیشے کا شہزادہ بن گیا تھا --- جو ٹھیس لگنے سے چیخ جاتا ہے۔ فہمیدہ کم فہم اور جھگڑالو عورت ہے --- وہ چاہتی ہے اس کے ناز اٹھاؤں --- نہیں اٹھا سکتا تو اپنی بدزبانی سے میرا جگر زخمی کر دیتی ہے...... میں گھر سے دور رہتا ہوں۔ باہر آوارگی کرتا ہوں --- رات بھر سکون سے سو نہیں سکتا --- گندے غلیظ بچے مجھے خوشی نہیں دے سکتے --- کوئی میرا خیال نہیں رکھتا --- کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا''......

وہ چپ ہو گیا۔
جیسے کوئی گلے میں اپنی چیخ دباتا ہے......
پھر اپنی آواز پر قابو پا کر بولا۔

''بہت دنوں بعد مجھے پتہ چلا --- کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ایک خوش اخلاق، نیک اطوار، شفیق اور خدمت گزار بیوی ہے --- تمہارا سلیقہ، تمہارا طریقہ تمہارا چلن --- تمہاری محبت ایک ایک بات مجھے یاد آ کر رلاتی رہی...... میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکا باسمہ --- اور آج بے اختیار تمہیں دیکھ کر ادھر آ گیا ہوں اور اعتراف کر رہا ہوں کہ بچے کا نہ ہونا اتنی بڑی محرومی نہیں۔ جتنی بڑی بدنصیبی تمہارے جیسی عورت کو ٹھکرانا ہے۔''

''اب آپ کہاں اتریں گے؟''

اسی سکون سے باسمہ نے پھر پوچھا۔

''کیا یہ میری بات کا جواب ہے؟'' امان نے غرا کر کہا۔''اس وقت سے میں جھک مار رہا ہوں؟''

''کیا یہی وہ باتیں تھیں جو آپ کرنا چاہتے تھے؟''

اس کا لہجہ کیسا اجنبی تھا---!

امان کو شرم سی آنے لگی---''ہاں---''اس نے کہا۔''کہنا تو اور بھی بہت کچھ تھا۔مگر تمہاری بے حسی نے میری زبان بند کر دی ہے۔''

باسمہ تھوڑا سا مسکرائی۔

''تم نے کہا تھا نا؟'' امان جلدی سے بولا۔''کہ تم میرے بغیر جی نہ سکو گے۔'' تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔اب میں زندہ تو ہوں مگر''...... پھر اس نے باسمہ کو غور سے سر سے پیر تک دیکھا۔اور تلخی سے بولا---''مگر تم خوش ہو۔مسرور ہو---تمہارے حلیے سے نظر آ رہا ہے--- ورنہ تم اتنی بنی سنوری کبھی نہ ہوتیں---تم نے بھی تو کہا تھا اگر میرے علاوہ کوئی اور مرد تمہیں چھولے گا تو تم مر جاؤ گی---عورتیں کس قدر جھوٹی اور ہرجائی ہوتی ہیں۔سچ ہے عورت صرف دولت پر مرتی ہے۔تم نے ایک امیر آدمی سے شادی کر لی اور تمہیں وہ غریب آدمی بالکل بھول گیا---موٹر لئے پھرتی ہو--- اپنا چہرہ دیکھو۔اتنا میک اپ تم پہلے کبھی نہیں کیا کرتی تھیں۔اتنی دیدہ دلیر اور فیشن ایبل تم پہلے کبھی نہ تھیں۔سچ بتاؤ کیا تمہیں میرا نعم البدل مل گیا ہے؟

''امان صاحب باسمہ نے گیئر بدلا اور بولی۔

''سب سے بڑی دولت قناعت کی دولت ہے۔پر مرد دنیا میں اللہ کا خلیفہ بن کر

بھی مطمئن نہیں ہوتا --- جب کہ ایک عورت اگر بانجھ پیدا کر دی جائے تو وہ اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہو جاتی ہے- مرد کو اللہ کی رضا پر صبر نہیں آتا- اللہ کی بنائی ہوئی دنیا میں دخل اندازی کرتا رہتا ہے- اس لئے بے سکون رہتا ہے-''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت مطمئن اور مسرور ہوں اور اللہ کی احسان مند بھی ---

''کیا تمہارا شوہر تم سے بے حد محبت کرتا ہے؟'' امان نے شکست خوردہ لہجے میں پوچھا --- اور پھر اپنے سوال کا زخم خود ہی کھا کر جواب دے بیٹھا-

''کوئی بدقسمت مرد ہوگا --- جو تمہیں حاصل کر کے تم سے محبت نہ کر سکے- تم تو خود سرتا پا محبت ہو-''

اسٹیئرنگ پر باسمہ کے ہاتھ لرز اٹھے --- اب معاملہ برداشت سے باہر ہوا جا رہا تھا اور ممکن تھا کہ ضبط کے اس سنگم پر کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے- بڑی دیر سے وہ اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی --- اور الفاظ ڈھونڈ رہی تھی اپنی کہانی کے حسب حال ---

اس دن جب اماں بی نے اسے نیم غشی کے عالم میں باپ کے گھر پہنچا دیا- تو دنیا اس کے آگے اندھیر ہوگئی- ماتم کرنے کی ستمگر نے مہلت نہ دی تھی اور جلدی جلدی کتاب زندگی کے ورق پلٹ گئے تھے- اس لئے اس نے چپ کا روزہ رکھ لیا --- مگر کئی دن تک وہ بستر پر پڑی امان کا انتظار کرتی رہی تھی کہ شاید صبح کی بھول شام کو یاد آ جائے --- نو سال کی تین ہزار دو سو پچاسی راتیں اس کے ساتھ بسر کی تھیں انہی راتوں میں کوئی شوخ رات ضدی بالک بن کر اس کی انگلی پکڑ لائے ...... اپنی کج ادائی پر اسے رونا آ جائے اور خود چلا آئے --- مگر اماں بی کا انتظام کچھ ایسا کچا نہیں تھا- انہوں نے پورے چار ماہ کے لئے امان اور فہمیدہ کو اس شہر سے باہر اپنی بہن کے پاس بھیج دیا

تھا- فہمیدہ کے پاس ہدایات کی گھڑی بھی تھی- البتہ طلاق کے باقاعدہ کاغذات گھر آ گئے تھے

ابا جی کی زبان مفلوج ہو چکی تھی- گو بول نہیں سکتے تھے' مگر دیکھ تو سکتے تھے- باسمہ جانتی تھی کہ ابا جی جانے والے ہیں- مگر اس نے ان سے یہ خبر چھپائی نہیں--- بلکہ انہیں سب کچھ بتا دیا--- ابا جی کی بولتی آنکھیں لمحے بھر کو ساکت ہو گئیں--- پھر انہوں نے اپنے وکیل کو بلوا بھیجا--- پہلے اپنی ساری جائیداد وقف کر کے جا رہے تھے- اس میں سے کچھ فلیٹ اور دو کانیں باسمہ کے نام کر دیں...... نئے سرے سے وصیت نامہ لکھوایا- نئے سرے سے ہدایات جاری کیں-

باسمہ کی عدت ختم ہو گئی--- مگر ابا جی کا دم اٹکا رہا- باسمہ کو اکثر یوں محسوس ہوتا کہ ابا جی پرواز کرنا چاہتے ہیں- مگر ان کے پر اڑنے سے انکار کر دیتے ہیں- شاید وہ ابا جی کی پرواز میں حائل ہو رہی تھی--- ان کی مردہ آنکھوں میں ایک زندہ سوال تھا جیسے کہنا چاہتے ہوں-

''مرنا چاہتا ہوں- مر نہیں سکتا- یوں میرے سامنے بیٹھی رہو گی تو کیسے مروں گا؟''

ابا جی کے پاس جو وکیل صاحب آتے تھے ان کا نام بھی عبدالوکیل تھا- اور وہ شہر کے نامی گرامی وکیل تھے- عمر میں ابا جی سے چھوٹے تھے- مگر ابا جی سے دوستانہ مراسم ایک عرصے سے تھے- بہت زیادہ لمبے اور دبلے پتلے تھے- ہاتھوں کی رگیں بھی صاف نظر آتی تھیں--- رنگت ان کی زرد زرد سی تھی--- اور آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں-

''ایک دن جب وہ کاغذات کے پلندے ابا جی کے پاس رکھ کر جانے لگے' تو باسمہ ان کے پیچھے لپکتی چلی گئی اور بولی-

''وکیل صاحب' ایک ذاتی سا سوال کرنا چاہتی ہوں۔''

''فرمایئے---'' وکیل صاحب موٹر میں بیٹھتے بیٹھتے رک گئے۔

''آپ نے شادی کیوں نہیں کی اب تک---؟'' وکیل صاحب کو ایک جھٹکا سا لگا......ناگواری کی شکن ان کی پیشانی پر نمودار ہوئی---مگر آہستہ سے بولے۔

''کوئی مجبوری تھی۔'' اور موٹر میں بیٹھ گئے۔

باسمہ دوسری طرف سے دروازہ کھول کر ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''کیا آپ نے کسی کو وچن دے رکھا تھا---؟''

''وکیل صاحب کو باسمہ کی یہ دخل اندازی بری لگ رہی تھی---

''نہیں۔'' وہ سختی سے بولے---''بعض لوگ محرومیوں کے ساتھ پیدا کئے جاتے ہیں۔اگر میں شادی کا اہل ہوتا تو مناسب وقت پر رشتوں کی کمی نہ تھی۔''

''ہاں وکیل وصاحب! باسمہ جلدی سے بولی۔'' قدرت بہت انصاف پسند ہے۔ وہ صرف مردوں پر ایسے ظلم نہیں ڈھاتی' عورتوں پر بھی ڈھاتی ہے۔میں بھی پیدائشی بانجھ ہوں۔اسی وجہ سے مجھے طلاق ہوگئی---آپ نے شادی نہیں کی کہ ایسی بدمزگی سے بچنا چاہتے تھے۔میں نے ہر ممکن طریقے سے شادی کو نبھانے کی کوشش کی' مگر بربادی میرا مقدر بن گئی۔''

وکیل صاحب نے حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی دیانت داری سے بولی

''آپ میرے ساتھ شادی کرلیں۔''

''بی بی' آپ ہوش میں ہیں۔''

''بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کہہ رہی ہوں۔میرے باپ کا دل مجھ میں ہے۔

ان کو سرخرو کرنا چاہتی ہوں۔

آپ تو خود قانون دان ہیں اور جانتے ہیں کہ ایک عورت جوان ہو۔ خوبصورت ہو اور پھر طلاق شدہ بھی ہو اور اس کے سر پر شرعی سائبان نہ ہو تو یہ دنیا اسے الزامات کے خنجر سے لہولہان کرتی رہتی ہے۔ اس کو ناکردہ گناہوں کی سلاخوں سے داغا جاتا ہے--- اس کے اجلے دامن پر پاپ کی پیک پھینکی جاتی ہے--- اگر آپ مجھ سے شادی کرلیں گے تو مجھے ایک باعزت اور شریف آدمی کا تحفظ مل جائے گا۔ معاشرے کی سب سے بڑی سیکورٹی مل جائے گی۔

ہے تو میری خود غرضی---مگر آپ سے کیا چھپانا---؟ میں نے ہوش سنبھالتے ہی امان کو اپنا دین وایمان سمجھا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتی کہ کوئی دوسرا آدمی کبھی مجھے چھو بھی سکتا ہے--- اگر کسی دن، کسی نے مجھے غلطی سے بھی چھولیا تو میں مرجاؤں گی۔ اس بات کا خطرہ آپ کے ساتھ رہنے میں تو نہیں نا!--- اس لئے تو جھولی پھیلا کے آگ کے سامنے آگئی ہوں۔ بھلا کبھی کوئی عورت یوں سوالی بن کے بھیک مانگتی ہے۔؟''

''اس کے عوض میں آپ کو کیا دوں گی؟''---آپ کے گھر میں آپ کی خادمہ بن کر رہوں گی۔ آپ بیمار رہتے ہیں۔ آپ کو ایک نرس کی ضرورت ہوگی۔ ایک تنہا مرد نرس رکھنے کا الزام کہاں اٹھا سکتا ہے---- مجھے نرس بنا کر رکھ لیجئے۔ آپ کو ایک منشی کی ضرورت ہوگی--- چپراسی کی ضرورت ہوگی--- بی اے تک میری تعلیم ہے--- آپ کے دفتر کا بہت سا کام کرسکتی ہوں۔ آپ کے موکلوں سے مل سکتی ہوں--- اور بھی کئی چھوٹے موٹے کام نکل آئیں گے--- بڑھاپے میں کسی دوست کی ضرورت ہوتی ہے---تنہا گھر میں دم گھٹتا ہے اور کیا آپ کے اطمینان کے لئے اتنا کافی نہیں کہ

آپ ایک بے آسرا عورت کو سہارا دے رہے ہیں--- میں اپنی ہر سانس کے ساتھ آپ کو دعا دوں گی- دعا کی تو ہر خا کی کو ضرورت ہوتی ہے-

دعا لینا چاہتے ہیں آپ وکیل صاحب؟''

باسمہ نے سب کچھ ایک ہی سانس میں اگل کے وکیل صاحب کی طرف رحم طلب اور پر امید نظروں سے دیکھا-

وکیل صاحب نے باسمہ کی آنکھوں میں دیکھا--- اس کے سچے اور صبیح چہرے کو پرکھا اور پھر مسکرا دیئے-

دوسرے دن چند احباب کی موجودگی میں نکاح ہو گیا-

ابا جی بول نہ سکے- مگر ٹکر ٹکر باسمہ کو دیکھتے رہے--- کہ اس نے ایک مریض اور بڑی عمر کے آدمی کا ہاتھ کیونکر پکڑ لیا- اور تیسرے دن ابا جی نے زبان کے ساتھ آنکھیں بھی بند کر لیں-

جانے خوشی تھی یا صدمہ---؟

اطمینان پاتے ہی چلے گئے......

باسمہ وکیل صاحب کے گھر آ گئی- گھر ویسا ہی تھا جیسا عورت کے بغیر ہوتا ہے- میلا کچیلا--- ا دوائیوں کی بے شمار خالی اور بھری ہوئی بوتلیں-

باسمہ کو ستھرائی اور پاکیزگی کا جنون تھا-

گھر دلہن بن گیا تو وکیل صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے- بولے-

''کون بد قسمت تھا وہ جس نے تمہیں طلاق دے دی--- مجھے یوں لگتا ہے اب سے پہلے میں قبرستان میں رہتا تھا- اگر ایک خوب صورت گھر میں' ایک سلیقہ شعار عورت رہتی ہو اور لوگ اسے تمہاری بیوی کہیں تو زندہ رہنے کے لئے یہی احساس کافی ہے---

باسمہ تم نے میری عمر بڑھادی ہے۔''

ویسے لوگوں نے وکیل صاحب اور باسمہ کی کم باتیں نہیں بنائی تھیں۔

''کھوسٹ کو عشق کا سودا ہوا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے تو سہرا باندھنے کا خیال آ گیا۔''

''ارے نہیں۔ ایک آدمی کا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ روز آنا جانا تھا وہاں--- اس کی بیوی اڑا لایا---''

دیکھو تو اس کے کرتوت--- کسی شادی شدہ جوڑے کو طلاق پر آمادہ کر لینا ان وکیلوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

''سچ ہے مرد کا کسی عمر میں اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔

''اور پھر باسمہ سے کون خوش تھا---؟''

''چار دن بھی نہ گزارے گئے شوہر کے بغیر--- عدت ختم ہوتے ہی شادی رچالی۔ سنا ہے پہلی شادی عشق کاری کا نتیجہ تھی۔ خوبصورت عورتوں کو شادیاں رچانے کا شوق ہوتا ہے۔''

''اللہ جانے بیچ میں کیا بات تھی۔ سنا ہے وکیل صاحب سے اس کا پرانا یارانہ تھا۔ باپ کے پاس آیا تھا۔ بس وہیں سے کوئی گڑبڑ شروع ہوگئی اور بات طلاق تک پہنچ گئی۔ تبھی تو جھٹ اس نے باپ کی عمر کے آدمی سے شادی کر لی۔''

''باپ بچارا اسی صدمے سے مر گیا۔ اب دوسرے شوہر کو کھائے گی۔''

باسمہ ان سب باتوں سے بے پروا--- دن بھر گھر کو بناتی' سنوارتی۔ شام کو وکیل صاحب دفتر گھر ہی لگاتے تھے۔ ان کی منشی گیری کرتی۔ ان کے مہمانوں کو چائے بنا بنا کر پلاتی۔ ان کی فائلیں ترتیب دیا کرتی۔

رات گئے ان کو بہت سی دوائیاں کھلا کر پانی کی بوتل میز پر رکھ کے۔ شب بخیر کہہ کے اپنے بیڈ روم میں آ جاتی۔ بیڈ روم کی ہر شے سفید تھی۔ مصفا اور معصوم۔۔۔ بستر پر رات گئے تک لیٹ کر وہ کتابیں پڑھا کرتی۔۔۔ اور پھر اپنی پرانی محبت کو خراج دینے کے لئے بلا ناغہ آنسو بہاتی اور سو جاتی۔

کبھی کبھی وکیل صاحب رات کو اٹھ کر اسے دیکھنے آتے تھے۔

وہ سوتے میں انہیں بہت اچھی لگا کرتی تھی۔ اپنے ہلکے زرد رنگ کے نرم تکیے کو دونوں بازوؤں میں بھینچ کر سینے سے لگا کے اپنا ایک رخسار اس پر ٹکا دیتی تھی۔ سوتے میں وہ معصوم بچی لگا کرتی تھی۔ جس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔۔۔ اور مچلتے مچلتے سو گئی ہو۔ کبھی کبھی اس کی لمبی پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسو وکیل صاحب کو صاف نظر آ جاتے شاید وہ سوتے میں مسلسل روتی تھی۔۔۔ کیونکہ وہ جاگتے میں مسلسل مسکراتی رہتی تھی۔ وکیل صاحب بے خودی کے عالم میں اسے دیکھتے رہتے۔ بڑھ کر کبھی نہیں چھوتے تھے۔۔۔ وہ جانتے تھے۔ چھونے سے یہ پری مر جائے گی۔۔۔ بڑی نازک ہے سانس کی گرم ہوا بھی نہیں سہہ سکتی۔ وہ اسے ہمیشہ زندہ دیکھنا چاہتے تھے۔۔۔ اس لئے اکثر دیکھ کر چلے جاتے تھے۔

رات بھر رونے والی یاسمہ صبح تازہ دم ہو کر اٹھتی۔ نئے سرے سے کاموں کی ابتدا کرتی۔ دس گیارہ بجے کاموں سے فارغ ہو کر وہ بہترین لباس پہنتی۔۔۔ خوب قرینے سے میک اپ کرتی' اپنی آنکھوں کو مسکارے سے سجاتی۔۔۔ ہونٹوں' رخساروں' پپوٹوں پر گلابیاں پھیر دیتی۔۔۔ وکیل صاحب کے کورٹ جانے کے بعد۔۔۔ وہ بھی اپنے اوپر خوشبوؤں کی بارش کرتی...... اور پھر موٹر نکال کر باہر نکل جاتی۔ وکیل صاحب نے اپنے بہت سے کام اس کے سپرد کر رکھے تھے۔ یعنی بنکوں میں جانا۔۔۔ ڈاکٹروں سے رابطہ رکھنا۔ ٹی وی اور موٹر کے لائسنس بنانا۔۔۔ وکیل صاحب کے دفتر کا حساب کتاب لکھنا۔

ضروری خطوں کے جواب دینا' ان کے عزیزوں سے رابطہ رکھنا--- وکیل صاحب کی زندگی کے کئی شعبے اس نے سنبھال رکھے تھے- ہر کام خوش اسلوبی سے کر رہی تھی- اپنی حیثیت سے بڑھ کر نظر آتی تھی کہ وہ وکیل صاحب کی واقعی مشکور تھی--- اگر وہ اس پر چادر نہ ڈالتے تو اس کا کیا حشر ہوتا--- خوب میک اپ کرتی تھی کہ چہرے کی کوئی سلوٹ دل کی شگفتگی کا راز نہ فاش کر دے- ہر وقت مسکراتی رہتی تھی کہ اس کا نام باسمہ تھا- اور باسمہ کا مطلب ہے- ''مسکرانے والی-''--- مسکرانے والیاں تو ہر دل کو اچھی لگتی ہیں--- ان کا دل مسکرائے نہ مسکرائے-

اس پر آج اس ظالم نے سر راہ اسے پکڑ لیا تھا اور اس کے پر سکون سمندر میں لہروں کا مدو جزر پیدا کرنا چاہ رہا تھا-

''امان!'' باسمہ نے پر سوز ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا-

''بی اماں کہا کرتی تھیں--- بانجھ عورت آسیب زدہ مکان کی طرح ہوتی ہے- جس میں کوئی مرد صرف پل دو پل ہی ٹھہر سکتا ہے-''

''وہ ٹھیک ہی کہتی تھیں آسیب زدہ مکان کو کتنا بھی سجائیں' قمقموں اور فانوسوں سے مالا مال کریں--- آرام دہ بنائیں--- جنت کا نظارہ بنائیں--- خوشبوؤں میں بسائیں--- تب بھی کون بسیرا لیتا ہے ایسے مکان میں---

سنسناہٹوں کی چیخیں اور وسوسوں کی آہٹیں اسے بھاگ جانے پر مجبور کرتی ہیں- نو سال تک میں اپنے جسم کے مکان کو سجا کے بیٹھی رہی......

پھر ایک دن تم نے مجھے آسیب زدہ ہونے کا احساس دلا دیا--- کیا جینے کے لئے اتنا حوصلہ کافی تھا......

ایسے مکان کی مالیت اور کرایہ کم کر دینے سے' کچھ مجبور لوگ بلاؤں کے ساتھ بسر

کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں---''

''باسمہ......

اب کے امان نے بڑی محبت سے کہا-

خوش تم بھی نہیں ہو شاید--- میں نے تمہیں ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا تھا--- ہم ایک دوسرے سے بچھڑ کر ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں--- آؤ اچھے دوستوں کی طرح دوبارہ ملا کریں-

''اچھے دوستوں سے تمہاری کیا مراد ہے---؟''

''ہونی انہونی تو نہیں ہو سکتی- مگر ہم اپنی زندگی کا کچھ وقت خوب صورتی سے ضرور گزار سکتے ہیں-''

''ایک دم باسمہ کا پاؤں بریک کو لگ گیا اور کار پچھلی کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی- تب اس نے آہستہ سے اپنی موٹر اس خطرناک موڑ سے نکالی اور ایک کونے میں کھڑی کر دی- اور اپنی خوبصورت گیلی گیلی آنکھوں پر اجنبیت کی کالی عینک چڑھا کر بولی-

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ لہو رونے والی آنکھوں کو نت برسنے والی پلکوں کو مسکارے کا غسل دیا جاتا ہے- سسکیاں بھرنے والے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہہ جمائی جاتی ہے--- اور داغ داغ دل کو خوبصورت ملبوسات میں لپیٹ دیا جاتا ہے ورنہ یہ دنیا جینے کا حق چھین لیتی ہے-''

تھوڑی دیر کے لئے وہ رک گئی- جیسے اپنے آنسو ضبط کر رہی ہو- پھر بولی-

''امان!''

طوائف اور عورت میں بڑا فرق ہوتا ہے- مرد--- اس فرق کو نہیں پہچان سکتا--- اس کے خمیر میں خود غرضی کے عناصر زیادہ شامل ہوتے ہیں- مرد اور عورت

دونوں ہی ایک مکان کی مانند ہوتے ہیں-مگر فرق میں تمہیں بتاتی ہوں-مرد ایک ایسا مکان ہے-جو بار بار اپنے مکین بدلنا چاہتا ہے-نت نئے کرائے دار بدل کے اسے مزہ آتا ہے-وہ پرانے لوگوں سے جلدی بیزار ہو جاتا ہے---مگر عورت---ایک ایسا مکان ہے جو زندگی میں صرف ایک بار آباد ہوتا ہے----ایک ہی بار مکین آتا ہے---اور اس میں سما جاتا ہے---اگر وہ پہلا مکین چھوڑ کو چل دے تو عورت اپنی مرضی سے آسیب زدہ مکان بن جاتی ہے---تا کہ کوئی دوسرا اس کے اندر قدم نہ رکھ سکے-میں نے تم پر احسان کرنے کے لئے تمہیں یہ سب کچھ نہیں بتایا---ایک فلسفہ سمجھایا ہے کہ میں نے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ کیوں کر سیکھا-

تمہارے جانے کے بعد اپنے تن کے اس مکان کو مقفل کر دیا---اور اس کی چابی یادوں کے پچھواڑے پھینک دی---پھر وقتاً فوقتاً میں نے اس قفل پر اپنی محرومیوں کے اتنے آنسو بہائے ہیں کہ یہ تالا زنگ آلود ہو گیا ہے-محبت کے زنگ آلود قفل کو دنیا کی کسی زبان کی حلاوت نہیں کھول سکتی---اس کو توڑنا پڑتا ہے---جو صرف موت کا پیغامبر اپنی پہلی ضرب سے توڑ دیتا ہے-

میرا شوہر ایک شریف آدمی ہے---میرا اس کے ساتھ ایک معاہدہ ہے---میں مقفل در کے اندر بیٹھی ہوں' مجھے دنیا کے شور و شر سے کچھ مطلب نہیں......اسی لئے تو مطمئن ہوں کہ چوری کا کھٹکا نہیں ہے-

کل رات تک میں ہر رات تمہاری یاد میں آنسو بہا کر سویا کرتی تھی-میں نے اپنے جی میں یادوں کا ایک تاج محل بنا لیا تھا---جس میں بچے کی ناآسودہ خواہش ممتاز محل کی طرح پڑی سوتی تھی---اور ہر رات میں تمہاری یاد کے چند آنسو پھولوں کی جگہ اس کی نذر کیا کرتی تھی امان!

ایسی گھٹیا بات کر کے تم نے مجھ سے یادوں کا وہ چراغاں چھین لیا ہے---آج کے بعد میں تمہیں اس طرح یاد نہ کر سکوں گی۔

مگر---ایک بات یاد رکھنا---قفل میرے تن پر اسی طرح رہے گا۔''

باسمہ نے دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھول دیا اور تیزی سے بولی۔

''اب تم جا سکتے ہو---!''

............☆............